معارف

مئی ۲۰۱۵ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۵ | ماہ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۱۵ء | عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات ۳۲۲
اشتیاق احمد ظلی

مقالات
عصر حاضر میں اسلامی قوانین جنگ کی معنویت ۳۲۵
ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی
انگریز سامراج کی آمد سے قبل اور بعد کا ہندوستان ۳۴۴
پروفیسر محمد انس خان
علامہ شبلی نعمانیؒ اور حیدرآباد ۳۷۲
سید شکیل احمد انور
روداد مولانا حالی یک روزہ سمینار ۳۸۰
کلیم صفات اصلاحی
اخبار علمیہ ۳۸۲
ک،ص اصلاحی
معارف کی ڈاک
تراجم شبلی ۳۸۵
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
آثار علمیہ و تاریخیہ
علامہ شبلی کا ایک نایاب قصیدہ ۳۸۷
اشتیاق احمد ظلی
آج کے ادبی تقاضے ۳۹۰
مولانا سید سلیمان ندویؒ
مطبوعات جدیدہ ۳۹۶
ع۔ص
رسید کتب ۴۰۰

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

مولانا الطاف حسین حالی (۱۹۱۴-۱۸۳۷ء) کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو شخصیات علم و ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر نمودار ہوئیں اور ایک عالم کو اپنی ضیا پاشی سے منور کیا ان میں مولانا حالی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سر سید کے ایک نامور رفیق کی حیثیت سے ان کی خدمات بہت روشن اور تابناک ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان تعلیم کی توسیع و ترویج اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں ان کا کام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ملی دردمندی، شرافت، وضع داری اور انکسار و تواضع وہ عناصر ترکیبی تھے جن سے ان کی دلآویز شخصیت کی تشکیل ہوئی تھی۔ اُس پر آشوب دور میں حالی ان منتخب شخصیات میں شامل تھے جن کی جڑیں نہایت مضبوطی سے ماضی میں پیوست تھیں لیکن ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی نگاہ بصیرت سے حال کے حقائق اور مستقبل کے مطالبات اور ضرورتیں مخفی نہیں تھیں اور وہ ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں اور مستعد رہے۔ حیات جاوید، یادگار غالب، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس حالی کو انقلاب آفریں تخلیقات کا درجہ حاصل ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ نہ صرف یہ کہ ان کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اہمیت اور معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے شاعری میں ایک نئی طرح کی بنیاد ڈالی اور بے زبانوں کی زبان بن گئے۔ ''بیوہ کی فریاد'' اور ''چپ کی داد'' جیسی نظموں کی اردو میں کوئی مثال نہیں۔ ''مسدس حالی'' کی مقبولیت اور اس کے اثرات کی عالم گیری کا اندازہ اس کے سلسلہ میں سر سید کی اس اعتراف سے کیا جا سکتا ہے۔ ''بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا؟ تو کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں''۔

علامہ شبلی کی طرح یہ سال مولانا حالی کا بھی صدی سال ہے۔ ان کے انتقال پر بھی سو سال پورے ہو چکے ہیں۔ عمر میں مولانا حالی علامہ شبلی سے بیس سال بڑے تھے۔ ان کا انتقال علامہ سے ایک مہینہ چند دن بعد ہوا۔ اس کی مناسبت سے مختلف جگہوں پر مولانا حالی کو یاد کرنے

اوران کوعقیدت ومحبت کا خراج پیش کرنے کے لیے سیمینار اور مجالس مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔کئی جگہ مولانا حالی اور علامہ شبلی کی یاد ساتھ ساتھ منائی گئی اور کئی جگہ خاص ان کے اوپر سیمینار کا انعقاد ہوا۔ ہماری معلومات کی حدتک جہاں جہاں ان کی یاد منائی گئی اس کی تفصیل یہ ہے ۔کاروان ادب برطانیہ،حلقہ ارباب ذوق اوراردو ٹائمز، مانچسٹر، سناتن دھرم کالج، پانی پت،ساہتیہ اکیڈمی، دہلی،شعبۂ اردو،حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی اوراردو اکیڈمی ،دہلی ان اداروں میں شامل ہیں جہاں مولانا حالی اور علامہ شبلی کوساتھ ساتھ یاد کیا گیا۔ایوان غالب، دہلی نے ان دونوں بزرگوں کے ساتھ مولانا محمد حسین آزاد کو بھی یاد کیا۔مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ممبئی نے ان کے ساتھ مولانا عبدالسلام ندوی اوراقبال سہیل کو بھی یاد کیا۔سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی ،علی گڑھ نے مولانا حالی کے اوپرایک سیمینار کا اہتمام کیا۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور ممکن ہے اس مناسبت سے بعض اور پروگرام بھی منعقد ہوں۔

ملک وملت پر مولانا حالی کے جو احسانات ہیں ان کا تقاضا تھا کہ دارالمصنّفین میں بھی ان کو یاد کیا جائے ۔مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں لکھا ہے کہ ''مولانا (شبلی) کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت ومحبت تھی''۔اس خصوصی تعلق نے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی۔علامہ شبلی سے مولانا حالی کو جو تعلق خاطر تھا اور جس طرح وہ ان کے کاموں کی قدردانی کرتے تھے اس کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا شاید بیجا نہ ہو کہ مولانا حالی اگر زندہ رہے ہوتے تو دارالمصنّفین کے بڑے قدرداں اور موید ہوتے ۔ان بزرگوں نے باہمی تعلقات کو جس انداز سے نبھایا اس کا ایک زمانہ گواہ ہے ۔لیکن ان کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی وہ بڑی تکلیف دہ اوراذیت ناک رہی ۔معاملہ اگر صرف ''معاصرانہ چشمک'' تک رہ جاتا تو بھی بات اتنی نہ بگڑتی لیکن شبلی شکنی کی مہم جس طرح شروع ہوئی اوراس نے جو شکلیں اورانداز اختیار کیے،ان کا ذکر بھی بہت اذیت ناک ہے۔جرم وسزا کی تاریخ کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ غلط یا صحیح شکایت ''حیات شبلی'' سے تھی اور سزا شبلی کو دی گئی اورسزا بھی ایسی کہ الاماں والحفیظ۔اگران کے علمی ورثہ میں اتنی غیر معمولی توانائی اورقوت نہ رہی ہوتی تو مدتوں پہلے گمنامی کے اندھیرے

اس کا مقدر بن چکے ہوتے۔اہل علم اور اہل دانش کے درمیان علمی امور میں اختلاف رائے ایک فطری امر ہے۔سوچنے اور غور وفکر کرنے والوں کے درمیان اختلاف ناگزیر ہے۔یہ ممکن نہیں کہ سب لوگ ایک طرح سے سوچیں اور یکساں نتائج تک پہنچیں۔تقلید کی توقع عوام سے کی جاتی ہے اہل علم ودانش سے نہیں۔اس عالم رنگ وبو کا حسن ورعنائی یک رنگی میں نہیں بلکہ رنگوں کی گوناگونی اور فراوانی میں مضمر ہے۔علمی امور میں اختلاف کی روایت ہماری تاریخ کے بالکل ابتدائی دور میں مستحکم ہوچکی تھی اور ہمیشہ اس کا احترام کیا گیا۔اختلاف رائے اگر محکم دلائل کی اساس پر استوار ہو، لب ولہجہ متین اور سنجیدہ ہو،تنقید مثبت ہو اور اس سے کسی کی تنقیص مقصود نہ ہوتو یہ ایک مفید عمل ہے اور اس سے علم ودانش کی ترقی وابستہ ہے۔اس سے نہ صرف یہ کہ ہراساں اور خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا استقبال کیا جانا چاہیے۔ہمارے بزرگوں کے اندر اس درجہ کی اعلیٰ ظرفی اور وضع داری تھی کہ علمی امور میں اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کے احترام اور وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے اور اس کا اثر باہمی تعلقات پر نہیں پڑتا تھا۔بدقسمتی سے بعد میں برداشت کی وہ سطح باقی نہیں رہی اور پوری صورت حال یکسر بدل گئی۔اس کے بطن سے جن خیالات ونظریات نے جنم لیا ان کو صحت مند نہیں کہا جاسکتا۔بہر حال اچھا یا برا جیسا تھا وہ وقت گذر گیا اور اب ضرورت نئی شروعات کی ہے۔وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ اب ان امور پر مزید قوت صرف نہ کی جائے۔اپنے بزرگوں کے علمی اور تحقیقی ورثہ کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کوئی معیوب بات نہیں لیکن بات بات میں باہمی تقابل اور موازنہ کچھ زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بھی نہیں۔بزرگوں کے کارنامے، خدمات اور اکتسابات ہماری مشترکہ میراث ہیں اور ہم کو ان پر فخر ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی زندگی سے سبق حاصل کیا جائے، ان کی عالی ظرفی اور کشادہ قلبی کی پیروی کی جائے۔ملک وقوم کی خدمت کے میدان میں انہوں نے جو تابناک اور روشن روایت قائم کی ہے اس کو مشعل راہ بنایا جائے اور سب کی دل سے عزت کی جائے۔دارالمصنّفین میں حالی سیمینار کی حیثیت، اس سلسلہ میں ایک ابتدا کی ہے۔یہ سیمینار ۲۶/اپریل کو منعقد ہوا اور اس کی مختصر روداد اسی شمارہ میں شامل اشاعت ہے۔انشاءاللہ اس سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ بھی شائع کیا جائے گا۔اس سلسلے میں بعض اور اقدامات بھی پیش نظر ہیں۔

مقالات

عصر حاضر میں اسلامی قوانین جنگ کی معنویت

ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی

تاریخ عالم گواہ ہے کہ اس کرۂ ارضی پر لڑی جانے والی اکثر و بیشتر جنگوں میں نہ کسی ضابطے کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ ہی کسی قانون واصول کی پاسداری کا خیال ذہن انسانی میں آتا ہے۔ بلکہ ان جنگوں کے ذریعہ کائنات انسانی کو فتنہ وفساد کی آماج گاہ بنادیا جاتا ہے اور انسانوں کو بے دریغ تہِ تیغ کردیا جاتا ہے اور جب میدان کارزار گرم ہوتو بلا فرق وامتیاز سب لوگوں کے ساتھ ایک سلوک اور برتاؤ کیا جاتا ہے۔

انسان کا بنایا ہوا ضابطہ اور وضع کیا ہوا قانون حالات کے نشیب وفراز اور مستقبل میں پیش آمدہ احوال وکوائف سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے اور اس میں مخصوص رنگ ونسل اور جنس و علاقہ کے رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے، اس لیے ایسے قانون کو ہمہ گیری اور جامعیت کا مقام نہیں ملتا۔ ان کے یہاں جنگ کے اغراض ومقاصد کا وجہ جواز کیا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ کن حالات میں جنگ کی اجازت دی جاسکتی ہے اور کن مواقع میں جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ کیا کمزور انسانوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے جنگ کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ جب جی چاہا اپنے جابرانہ نظام کے تسلط کے لیے کسی بھی ملک کی سرحد میں جنگی جہاز اتار دیا، ان تمام سوالوں کا تشفی بخش جواب انسانی قوانین جنگ میں نہیں مل سکتا۔ اسی لیے انسانوں کا خودساختہ قانون امن وآشتی کا ضامن بھی نہیں بن سکتا۔

اس کے بالمقابل دین اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔ اسلام نے میدان جنگ کے

شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انڈیا)۔

لیے بھی اصول وضابطے مقرر کیے ہیں۔ان کا پاس ولحاظ رکھنا ہراہل ایمان پر فرض ہے۔اس کے اصول وقواعد سے کسی کو مفر نہیں ہے، کیونکہ اعلیٰ وارفع مقصد کے حصول کے لیے جب جنگ ناگزیر ضرورت بن جائے تو بھی تلوار اٹھانے والوں کو کھلی چھوٹ نہیں ملتی ہے، بلکہ حدود وقیود میں رہ کر فتنہ وفساد، سفاکیت ودرندگی اور ظلم وجور کے سدباب کے لیے اپنی طاقت وقوت کا استعمال بجا قرار دیا جاتا ہے۔

یہ اعزاز تو صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے جنگ وجہاد کے واضح مقاصد متعین کیے اور اس کے آداب واصول مرتب کیے اور بلا جواز قتل وخوں ریزی کو سنگین جرم قرار دیا۔کسی مسلمان فرد کو یا اسلامی حکومت کو ان بنیادی اصول وضوابط میں ترمیم کا حق حاصل نہیں ہے۔اسلامی قوانین ہمہ گیر اور دائمی نوعیت کے ہوتے ہیں۔نامور مصری عالم رقم طراز ہیں:

> ''اسلام کی یہ جنگیں کسی فوجی قائد کی خود غرضی اور ہوس ملک گیری کی پیداوار نہیں تھیں نہ ان کے پیچھے دوسروں کو غلام بنانے کا جذبہ کارفرما تھا، بلکہ یہ جنگیں محض خدا کے لیے لڑی گئیں اور ان کا اصل مقصد رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ تھا، مگر بات صرف جذبہ پر ہی ختم نہیں ہوجاتی، بلکہ اس نے ان جنگوں کے لیے باقاعدہ اصول وقوانین بھی مقرر کیے''۔(۱)

اسلامی قوانین جنگ کے تعلق سے ذیل میں وہی امور اختصار سے بیان کیے جارہے ہیں جن پر قوانین جنگ کی بنیاد قائم ہے۔

اطاعت امیر: اسلامی قانون میں جنگ کے تمام اعمال کی ذمہ داری اور امر ونہی کے تمام اختیارات کا حامل امیر کو بنایا گیا ہے۔جنگ کی کوئی معمولی کارروائی بھی امیر کی اجازت کے بغیر نہیں کی جاسکتی ہے۔اسلام نے اطاعت امیر کو خدا اور رسول کی اطاعت کے برابر قرار دیا ہے اور اس کی نافرمانی کو وہی درجہ دیا ہے جو خدا ورسول کی نافرمانی کا ہے۔اطاعت امیر کو خیر وفلاح کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے ارشاد ربانی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ	اے ایمان لانے والو! تم اللہ اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں جو اہل حکومت ہیں ان کا بھی۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۲)

پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر دیا کرو اگر تم اللہ اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام بہتر ہے۔

نبی کریم ﷺ کا پاک ارشاد ہے:

الغز و غزوان، فاما من ابتغى وجه اللّٰه واطاع الامام وانفق الكريمة و ياسر الشريک واجتنب الفساد فان نومه و نبهه اجر كله واما من غزا فخرا ورياء وسمعة عصى الامام وافسد في الارض فانه لم يرجع بالكفاف ۔(۳)

لڑائی دو قسم کی ہیں، جس شخص نے خالص اللہ کی رضا کے لیے لڑائی کی اور اس میں امام کی اطاعت کی اپنا بہترین مال خرچ کیا اور فساد سے پرہیز کیا تو اس کا سونا جاگنا سب اجر کا ذریعہ ہے اور جس نے دنیا کو دکھاوے اور شہرت و ناموری کے لیے جنگ کی اور اس میں امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد پھیلایا تو وہ برابر بھی چھوٹے گا۔ یعنی الٹا عذاب میں مبتلا ہوگا۔

ایک دوسرے مقام پر حدیث پاک میں آتا ہے:

من اطاعني فقد اطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله ومن اطاع الامام فقد اطاعني ومن عصى الامام فقد عصاني ۔(۴)

جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

نبی کریمؐ نے امیر کی اطاعت پر اس قدر زور دیا کہ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ ایک حبشی غلام جس کے ناک کان کٹے ہوئے ہوں، حاکم بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت بھی واجب ہے۔ارشاد سنیے:

ان امر علیکم عبد حبشی مجدع فاسمعوا لہٗ واطیعوا ماقادکم بکتاب اللّٰہ ۔(۵)

اگر تم پر ایک حبشی غلام جس کے ناک کان کٹے ہوئے ہوں، حاکم بنادیا جائے اس کی بھی اطاعت کرو، بشرطیکہ وہ کتاب اللہ پر تمہیں عمل کرواتا ہو۔

دوران جنگ اگر اطاعت امیر کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو اس سے شکست و ہزیمت کے ساتھ ساتھ جانی و مالی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔جیسا کہ غزوۂ احد میں فرمان نبوی سے حکم عدولی اور امیر کی اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے بڑا جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔اس واقعہ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔پس قرآن وسنت کی درخشاں تعلیمات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اطاعت امیر ایک اہم حکم ہے جس کی اطاعت ہر فرد پر لازم ہے۔

ایفائے عہد: ایفائے عہد کے تعلق سے کتاب اللہ میں متعدد فرامین اور ہدایتیں موجود ہیں حضور علیہ ﷺ نے بھی اس کی سخت تاکید فرمائی ہے،ایک جگہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (٦)

اور تم اللہ کا عہد پورا کردیا کرو جب تم عہد کرو اور قسموں کو پختہ کرلینے کے بعد انہیں مت توڑا کرو، حالانکہ تم اللہ کو اپنے آپ پر ضامن بناچکے ہو بے شک اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

وفا شعاری اور تقویٰ کی سند ان کے لیے ہے جو لوگوں سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو نہیں توڑتے ، بلکہ پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، اللہ رب العزت کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے ایفائے عہد کرتے ہیں اور جس قول وقرار کو برقرار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، خشیت الٰہی کے ساتھ اس کی پاس داری ولحاظ بھی کرتے ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَالَّذِيْنَ

اور جو لوگ اللہ سے جو کچھ انہوں نے عہد کیا، اس کو پورا کرتے ہیں اور وہ اس عہد کو توڑتے

يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (۷)	نہیں۔اور یہ ایسے ہیں کہ اللہ نے جن علاقوں کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے، ان کو قائم رکھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور سخت عذاب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔

عہد و پیمان اگر کرلیا ہے تو اس کو نبھانا ضروری ہے ورنہ نقض عہد کی وجہ سے اس سے مواخذہ ہوگا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۸)	اور وعدہ پورا کیا کرو یقیناً وعدہ کے لیے ضرور باز پرس ہوگی۔

مشرکین مکہ نے ابورافع کو اپنا قاصد بنا کر بارگاہ رسالت میں بھیجا۔ بارگاہ نبویؐ کا اثر ابورافع کی ذات پر اتنا ہوا کہ مشرف بہ اسلام ہوگئے اور حضورؐ سے عرض کیا کہ میں کافروں کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔آپؐ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد و پیمان کی خلاف ورزی ہے۔تم ابھی جاؤ، پھر واپس آجانا۔حدیث شریف میں آتا ہے۔

ان ابا رافع اخبره قال بعثنی قریش الی رسول اللّٰہ فلمارایت رسول اللّٰه ﷺ القی فی قلبی الاسلام فقلت یارسول اللّٰہ ﷺ انی و اللّٰہ لا ارجع الیھم ابدا فقال رسول اللّٰه ﷺ انی لااخیس بالعھد ولا احبس البرد ولکن ارجع فان کان فی نفسک الذی فی نفسک الآن فارجع ۔(۹)	ابورافع نے فرمایا کہ قریش نے مجھے نمایندہ بنا کر نبی کریمؐ کے پاس بھیجا۔ جب میں نے نبی کریمؐ کو دیکھا تو اللہ نے میرے دل میں اسلام ڈال دیا۔میں نے عرض کیا یارسول اللہؐ خدا کی قسم میں اب کبھی ان کی طرف لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔نبی کریمؐ نے فرمایا میں عہد نہیں توڑتا اور نہ قاصد کو قید کرتا۔تم اس وقت واپس جاؤ اور جو چیز اس وقت تمہارے دل میں ہے اگر وہ برقرار رہے تو واپس چلے آنا۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو جندلؓ پاؤں میں زنجیریں پہنے ہوئے آئے اور زخموں سے چور بدن کو حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا اور عرض کیا کہ مشرکین مکہ مجھ پر مصائب و

آلام کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، لیکن مشرکین مکہ سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان اگر مکے سے بھاگ کر آئے گا تو ہم اس کو قریش کے پاس بھیج دیں گے۔ صحابہ کرام کی جماعت حضور ﷺ سے سفارش کر رہی تھی کہ ان کو واپس نہ بھیجا جائے تاکہ ابو جندلؓ مزید جور و ستم کا نشانہ نہ بنیں لیکن آپؐ نے فرمایا کہ معاہدہ لکھا جا چکا ہے۔اس کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔لہٰذا ابو جندلؓ کو آپؐ نے پناہ دینے سے انکار کر دیا اور حسب معاہدہ وہ قریش مکہ کے حوالے کر دیے گئے۔

ان تمام آیات، احادیث مبارکہ اور واقعات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ آپؐ نے جو معاہدہ کیا اس کو ہر حال میں پورا کیا۔حالانکہ آپ ﷺ کو یہ خوب معلوم تھا کہ مکہ کے مسلمان ناگفتہ بہ مصائب و مشکلات سے دوچار ہیں لیکن آپؐ نے تاحین حیات ایفائے عہد کا عظیم الشان نمونہ پیش کیا، بلکہ آپؐ نے تو یہاں تک فرمایا کہ کسی معاہد سے عہد و پیمان توڑنے والا جنت کی خوشبو سے محروم ہوگا۔حدیث شریف میں آتا ہے:

قال رسول اللّٰہ ﷺ من قتل معاھداً فی غیر کنھہ حرم اللّٰہ علیه الجنة (۱)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی معاہد کو بغیر کسی وجہ سے قتل کر دے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

من کان بینه و بین قوم عھد فلا یشد عقدة و لا یحلھا حتی ینقضیٰ امدھا او ینبذ الیھم علی سواء (۱۱)

جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو اس گرہ کو مضبوط کرے اور وہ نہ کھولے یہاں تک کہ جب مدت گذر جائے تو وہ برابری پر عہد کو توڑے۔

اسیران جنگ کے قتل کی ممانعت: اہل عرب اسیران جنگ سے نہایت برا سلوک و برتاؤ کیا کرتے تھے، جیسا کہ موجودہ دور میں امریکہ کی گوانتا موبے جیل میں قیدیوں کے ساتھ کیا جانے والا برتاؤ دنیا کے سامنے موجود ہے۔لیکن اس کے بالمقابل اسلام نے جنگی قیدیوں کے ساتھ مشفقانہ سلوک کی تاکید فرمائی اور یہ قانون وضع کر دیا کہ نہ ہی ان کو ایذا پہنچائی جائے گی اور نہ ان کو قتل کیا جائے گا۔آپؐ کا ارشاد ہے:

لا تجهزن علی جریح ولا یتبعن	زخمی پر حملہ نہ کرو بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرو
مدبر ولا یقتلن اسیر ومن اغلق	قیدیوں کو قتل نہ کرو اور جو اپنا دروازہ بند کرے
بابه فهو امن ۔(۱۲)	اس کو امان دے دو۔

اسیران جنگ سے متعلق اسلام کا قانون یہ ہے کہ جنگ جب اپنے اختتام کو پہنچ جائے تو انہیں بغیر فدیہ کے یا فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ اگر انہیں قیدی بنا کر رکھا جائے تو ان کے ساتھ اچھا سلوک و برتاؤ کیا جائے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ	پس (اے ایمان والو) جب تمہارا معاملہ کافروں
الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ	سے ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا	جب خوب قتل کر چکو تو ان کو رسی سے باندھ لو۔
فِدَآءً (۱۳)	اس کے بعد (تم کو اختیار ہے کہ یا تو احسان رکھ
	کر) رہا کر دو یا معاوضہ لے کر چھوڑ دو۔

اسیران جنگ کو صرف قیدی بنا کر رکھنے کے لیے ہی نہیں کہا گیا بلکہ ان کے ساتھ نرمی و ملاطفت کی بھی تعلیم دی گئی۔ قرآن مجید میں اسیر اور مسکین و یتیم کو کھانا کھلانے کے عمل کے لیے تحریض و ترغیب کی گئی ہے اور اسے نیکو کاروں کا فعل قرار دیا گیا ہے۔

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ	وہ خاص اللہ کی خوشنودی کے لیے مسکین اور یتیم
مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا	اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو
نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ	محض اللہ کے لیے تمہیں کھلاتے ہیں۔ کسی
جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا اِنَّا نَخَافُ مِنْ	جزا یا شکریہ کے خواستگار نہیں ہیں۔ ہم تو صرف
رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (۱۴)	اس تنگی کے دن سے ڈرتے ہیں جس میں شدت
	تکلیف سے چہرے بگڑ جائیں گے۔

آپ ﷺ نے جنگی قیدیوں کو اہل ایمان کا بھائی قرار دیا اور تاکید فرمائی کہ تم ان کے ساتھ بھی اپنے بھائیوں جیسا معاملہ کرو۔ فرمایا:

ان اخوانکم خولکم جعلهم اللّٰه	یہ تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جن کو اللہ

تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ، و لا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم ۔ (۱۵)

نے تمہارا دست نگر بنایا ہے۔ پس جس کا بھائی اس کے ماتحت ہو، اسے چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے، تم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور اگر ایسی کسی بھاری خدمت کو ان کے ذمہ کرو تو خود ان کا ہاتھ بٹاؤ۔

جنگ بدر میں مشرکین مکہ کے ستر سے زیادہ آدمی مارے گئے اور کم وبیش اتنے ہی قیدی بنا کر لائے گئے۔ آپ ﷺ نے قیدیوں کو صحابہ کے درمیان تقسیم کر دیا اور نصیحت کیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک و برتاؤ کرو۔

حضرت حسن بصریؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوتی بالاسیر فید فعہ الی بعض المسلمین فیقول احسن الیہ فیکون عندہ الیومین والثلاثۃ فیوثرہ علی نفسہٖ ۔ (۱۶)

رسول اللہؐ کے پاس قیدی لایا جاتا تو آپ اسے کسی مسلمان کے حوالے کر دیتے اور فرماتے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو، یہ قیدی ان کے پاس دو تین دن رہتا اور وہ مسلمان اس کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا تھا۔

مثلہ کی ممانعت: دشمن کی لاشوں کو بے حرمت اور ان کے اعضاء کی بے حرمتی کرنے سے اسلام نے سختی سے منع کیا ہے یہ کسی بھی طرح سے جائز نہیں ہے کہ انسانی لاشوں کے ساتھ درندگی کا ثبوت دیا جائے۔

عبداللہ بن یزید انصاریؓ روایت کرتے ہیں:

نھی النبی ﷺ عن النھب والمثلۃ ۔(۱۷)

آپ ﷺ نے لوٹ کے مال اور جسم کو مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

لاشوں کا مثلہ نہ کرنا اور مہذب طریقہ کار اپنانا ایمان کی علامت ہے۔ فرمان مقدس ملاحظہ کیجیے:

عن عبد اللّٰہ قال رسول اللّٰہ ﷺ اعف الناس قتلہ اھل الایمان ۔(۱۸)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے مروی ہے کہ کفار کو اچھے طریقے سے قتل کرنے والے اہل ایمان ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ مثلہ کرنے سے منع فرماتے اور صدقہ کرنے کی تلقین کرتے تھے، ارشاد رسالت مآب ﷺ ہے:

کان رسول اللّٰہ ﷺ یحثنا علی الصدقۃ وینھا نا عن المثلۃ ۔(۱۹)

نبی کریمؐ ہم کو صدقہ کرنے کی ترغیب دیتے اور مثلہ کرنے سے منع فرماتے تھے۔

بدنظمی اور انتشار کی ممانعت: اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ جب دشمنوں کے مقابلے پر نکلتے تھے تو راستے میں جو بھی ملتا تھا اس کو تنگ کیا کرتے تھے اور جہاں بھی خیمہ زن ہوتے وہاں پر بالکل پھیل جاتے تھے، یہاں تک کہ راستوں پر چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس قسم کی حرکت و عمل سے منع فرمایا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ کوئی اگر اس طرح کا عمل کرے گا تو اس کا جہاد، جہاد نہیں ہوگا۔

عن انس قال غزوت مع نبی اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۃ کذا و کذا فضیق الناس المنازل و قطعوا الطریق فبعث نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم منادیًا ینادی فی الناس ان من ضیق منزلا او قطع طریقا فلا جھاد لہ۔(۲۰)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریمؐ کے ساتھ فلاں فلاں غزوات میں حصہ لیا۔ ایک منزل پر لوگوں نے جگہ تنگ کر دی اور راستہ بند کر دیا۔ اس وقت رسول اللہؐ نے لوگوں میں یہ منادی کرادی جو فرودگاہ کو تنگ کردے اور راستہ روکے تو اس کو جہاد کا ثواب نہ ملے گا۔

ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے اس طرح کے طریقہ کار کو شیطان کا عمل قرار دیا ہے۔

ان تفرقکم فی ھذہ الشعاب والأودیۃ انما ذالکم من الشیطان۔(۲۱)

تمہارا اس طرح وادیوں اور گھاٹیوں میں بکھر جانا یہ شیطان کی طرف سے ہے۔

آگ میں جلانے کی ممانعت: اقوام عالم کی جانب سے بالعموم اور اہل عرب سے بالخصوص

اس قدر وحشیانہ حرکتیں سرزد ہوتی تھیں کہ انسانیت شرم سار ہو جائے۔ وہ جوش انتقام میں اپنے دشمنوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے۔ لیکن اسلام نے اس طریقہ کار پر پابندی عائد کر دی۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ہم لوگوں کو لڑائی پر جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ فلاں فلاں آدمی تم کو ملیں تو ان کو جلا دینا مگر جب ہم روانہ ہونے لگے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

انی کنت امرتکم ان تحرقوا فلاناً وفلاناً بالنار وان النار لا یعذب بھا الا اللّٰہ فان وجدتموھما فاقتلوھما ۔(۲۲)	میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ فلاں فلاں اشخاص ملیں تو جلا دینا مگر آگ کا عذاب سوائے خدا کے کوئی نہیں دے سکتا اس لیے اگر تم انہیں پاؤ تو بس قتل کر دینا۔

غیر محارب سے عدم تعارض: اسلام نے جو قوانین جنگ وضع کیے ہیں ان میں اتنی جامعیت ہے کہ دور جدید کا مہذب انسان بھی ان کو قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسلام کے جنگی قوانین کے مطابق دشمن ہوں یا دوست اور عقائد و نظریات کے اعتبار سے خواہ وہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، بشرطیکہ نہ تو وہ ظالموں میں ہوں اور نہ ہی دین حق کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والے ہوں۔ قرآن مجید کی یہ واضح تعلیم ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۲۳)	اللہ تم لوگوں کو ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے میں نہ لڑیں اور نہ ہی تم کو انہوں نے تمہارے گھروں سے نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''اس باب میں اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جو اہل قتال میں سے ہے اس کا قتل جائز ہے خواہ وہ بالفعل لڑے یا نہ لڑے اور ہر وہ شخص جو اہل قتال سے نہیں ہے اس کا قتل ناجائز ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ حقیقتاً

لڑائی میں شامل ہو یا مقاتلین کے سے کام کرنے لگے"۔(۲۴)

معاہدہ ختم ہونے سے قبل جنگ کی ممانعت: اسلام نے ہر سطح پر بدعہدی اور وعدہ شکنی کو منع کیا ہے اور اسے اہل ایمان کے لیے قابل مذمت فعل قرار دیا ہے۔ اسلام میں میعاد معاہدہ ختم ہونے تک جنگ کرنے کی ممانعت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ جنگ بندی معاہد ہے اس کو پورا کرنا ہوگا، بشرطیکہ فریق مخالف کی طرف سے نقض عہد کا ارتکاب نہ ہو یا ان کی طرف سے دشمنوں کی مدد نہ کی گئی ہو۔ اگر معاہد کے خلاف مسلمان مدد طلب کرے تب بھی معاہدہ کا لحاظ رکھا جائے گا اور اس کو توڑا نہیں جائے گا۔ عام حالات میں معاہدے کے تقدس کا خیال رکھا جائے گا۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ ۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ"۔(۲۵)	اگر وہ دین کے معاملات میں تم سے مدد چاہیں تو ان کی مدد کرنا واجب ہے مگر اس قوم کے مقابلہ میں مدد نہ کرنا کہ تمہارے اور ان کے درمیان صلح و امن کا معاہدہ ہوا ہے۔

عام حالات میں معاہدہ کا احترام و تقدس ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۲٦)	سوائے ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ پر کسی کی مدد کی سو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک ان کے ساتھ پورا کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کو پسند کرتا ہے۔

اسلام نے مسائل جنگ میں معاہدین کے چند اصولی حقوق متعین کر دیے ہیں، جن کی روشنی میں اسلام کا نظریۂ جنگ و امن متعین ہوتا ہے اور دوسری طرف بشر دوستی اور انسانیت نوازی سے متعلق اسلام کی درخشاں تعلیمات بھی سامنے آتی ہیں۔ ذیل میں ان چند اصولوں کو بالاختصار سپرد قلم کیا جاتا ہے:

۱- جب تک معاہد قوم عہد پر قائم ہے اس کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کرنا مسلمانوں کے

لیے سخت ممنوع ہے۔ ۲- اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت کسی معاہد قوم کے ملک میں آباد ہو اور اس پر ظلم ہو رہا ہو تو اسلامی حکومت مسلمانوں کی حمایت نہیں کر سکتی ۔ ۳- ہاں جب تمہارا اور معاہد قوم کا معاہدہ ختم ہو جائے اور کوئی قانونی و اخلاقی ذمہ داری باقی نہیں ہے مطلع کر دیا جائے کہ اب ہمارا معاہدہ ختم ہو گیا ہے۔

لوٹ کھسوٹ کی ممانعت: اسلام سے قبل محض مال غنیمت کے حصول کے لیے بھی جنگوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تجارتی قافلوں اور راہ گیروں کو لوٹنا پیشہ بن چکا تھا۔ لیکن اسلام نے اس شنیع عمل کی پرزور مذمت کی ۔ آنحضرت ﷺ نے لوٹے ہوئے مال کو حرام قرار دیا۔

نھی عن النھبة والمثلة ۔(۲۷) آنحضرتؐ نے لوٹ مار اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ایک دوسری جگہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

من انتھب نھبة فلیس منا ۔(۲۸) جو شخص لوٹ مار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

گویا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اگر لوٹ مار اور فتنہ و فساد میں مشغول ہو جائیں اور غیر اخلاقی حرکتوں کے مرتکب ہوں۔ جن کی بنا پر عوام و خواص میں اضطراب و بے قراری عام ہو جائے تو راہ حق میں اٹھنے والے یہ قدم خیر کا باعث نہ بن کر شر کا موجب قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا جذبۂ عمل اللہ رب العزت کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے محروم رہتا ہے۔

اسلام میں تباہی و بربادی کی ممانعت: اسلام نہ تو خون ناحق کو بہانے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی دشمنوں کے املاک و جائداد کو تباہ و برباد کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی یہ اعمال اسلام کے مقاصد جلیلہ کے شایان شان ہیں ۔ اسلام فتنہ و فساد کو ناپسند کرتا ہے اس لیے کہ حقیقی معنوں میں یہ امن و آشتی کا علمبردار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حالت جنگ میں بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے، نہ کھیتیاں تباہ و برباد کی جائیں، نہ پھل دار درختوں کو کاٹا جائے اور نہ ہی املاک کو نذر آتش کیا جائے ۔ یہاں تک کہ کفر و شرک کا علمبردار میدان جنگ میں بھی اہل ایمان سے امن و عافیت کا خواہاں ہے تو ہاتھ روکنے کا حکم ہے۔ اسلام کو اگر وہ سمجھنا چاہتا ہے تو اس کو موقع دیا جائے گا اور پھر اگر وہ اسلام سے بیزاری ہی کا اظہار کرے تو حکم یہ ہے کہ اسے اس کے محفوظ مقام

تک پہنچا دیا جائے۔

لیکن مہذب عصر حاضر کے انسانوں کے خود ساختہ قانون امن و جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اپنے حریف کو مغلوب کرنے کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ	اور جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ
فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ	زمین میں فساد پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۹)	کو برباد کردے۔ مگر اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام فتنہ وفساد کا قلع قمع کرنے کے لیے موثر اقدام وعمل کی ترغیب دیتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ اسی قیام امن کے لیے ہے، جس میں اعلیٰ انسانی اخلاق برتنے کی تعلیم و تلقین ہے۔ جس میں کھیتوں اور فصلوں کی بربادی اور درختوں کے کاٹنے اور جلانے تک سے روکا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب کسی لشکر کو روانہ کرتے تو امیر لشکر کو چند ہدایات ضرور دیتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت اسامہؓ کے لشکر کو آپ نے روانہ کیا تو ان کو دس ہدایات دیں، آپؓ نے ارشاد فرمایا:

يـا ايها الناس قفوا أوصيكم بعشر،	فرمایا۔ لوگو! ٹھہرو! میں تم کو دس باتوں کی
فـاحـفـظـوهـا عنى ، لا تخونوا ولا	نصیحت کرتا ہوں تم اس کو یاد رکھنا۔ دیکھو!
تـغـلـوا، ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا	خیانت نہ کرنا، فریب نہ کرنا، سرکشی نہ کرنا،
تـقتـلـوا طـفلاً صـغيراً، ولا شيخـاً	دشمن کے ہاتھ پاؤں نہ کاٹنا، چھوٹے بچوں،
كبيراً ، ولا امرأةً ، ولا تعقروا نخلا	بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے
ولا تـحـرقـوه ، ولا تقطعوا شجرة	درخت کو نہ اکھاڑنا اور نہ اس کو جلانا، پھل دار
مثمرة، ولا تذ بحـوا شاةً ، ولا بقرة،	درخت کو نہ کاٹنا۔ بکری، گائے اونٹ کھانے
ولا بعيراً الالمأكلة ۔(۳۰)	کے سوا ذبح نہ کرنا۔

شب خون مارنے کی ممانعت: اسلام نے ہر سطح پر منافقت، ریاکاری، دھوکہ اور فریب پر ضرب لگائی ہے۔ اس کے جنگی قوانین میں بھی دھوکہ اور فریب کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلامی قوانین جنگ میں ایک بات یہ بھی بہت اہم ہے کہ دشمن پر رات کے وقت حملہ نہ کیا جائے اور صبح ہونے کا انتظار کیا جائے۔ یہی بہادری وشجاعت کا تقاضا بھی ہے۔ آپ ﷺ کا طریقہ کار یہ تھا

کہ جب کسی قوم پر رات کو پہنچتے تو صبح ہونے تک حملہ نہ کرتے۔

ان رسول اللہ ﷺ اتی خیبر لیلا وکان اذااتی قوماً بلیل لم یغزبھم حتی یصبح ۔(۳۱)	رسول اللہؐ رات کے وقت خیبر کے مقام پر پہنچے چنانچہ آپؐ کا معمول تھا کہ جب کسی جگہ رات کو پہنچتے تو صبح ہونے تک ان لوگوں پر حملہ نہیں کیا کرتے تھے۔

عصمت دری کی ممانعت: اسلام کے جنگی قوانین کے مطابق بلا وجہ کسی عورت کو قتل نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی عفت وعصمت کو داغدار۔ اسلام اپنے پیروکاروں کی ذہنی پا کیزگی کا پورا اہتمام کرتا ہے اور انہیں ہر طرح کی جنسی آلودگی سے پاک رکھتا ہے۔اسلام نے عورت کو تحفظ فراہم کیا، معاشرہ میں عزت واحترام کے ساتھ مفتوح قوم کی عورتوں کی عصمت کی پاسبانی کا حکم دیا۔

شرکائے جہاد کے لیے حکم دیا کہ جو رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے ہیں وہ ازدواجی حقوق ادا کرنے کے بعد جہاد میں شریک ہوں۔آپؐ کا ارشاد ہے:

غـزا نبی من الانبیاء فقال لقومہٖ لا یتبعنی رجل ملک بضع امراۃ وھو یرید ان یبنی بھا ولما یبن بھا (۳۲)	کسی نبی نے جہاد کا ارادہ کیا تو اپنی قوم سے فرمایا میرے ساتھ جہاد پر وہ شخص نہ جائے جس نے ابھی شادی کی ہو اور عورت سے ہم بستر نہ ہوا اور وہ مجامعت کرنا چاہتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ہر فوجی کو چار ماہ بعد اپنے اہل خانہ کے پاس واپس جانے کو لازمی قرار دیا تھا تا کہ مجاہدین اسلام کے ذہن ودل میں فحاشی و بدکاری کے رجحان نشوونما نہ پائیں۔

انتقامی کارروائی کی ممانعت: اسلام عفو درگزر سے کام لیتا ہے۔اسلامی ریاست ومملکت میں انتقامی سیاست کا کوئی تصور موجود نہیں ۔ یہاں تک کہ جنگوں میں بھی انتقامی کارروائی کی ممانعت کردی گئی ہے۔تاریخ عالم گواہ ہے کہ فاتح اقوام جوش انتقام میں فتح وکامرانی کے بعد قتل وغارتگری کا بازار گرم کردیتی ہیں۔قرآن مجید میں اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ	اس نے کہا (کہ لڑائی بذات خود کوئی اچھی چیز نہیں ہے) جب بادشاہ کسی بستی میں داخل

اَذِلَّةً وَ کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ (۳۳)

ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کردیتے ہیں اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے۔

اذیتیں دے کر ہلاک کرنے کی ممانعت: دیگر اقوام وملل میں دشمن کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا لیکن اسلام نے اس کو انتہائی معیوب و مذموم قرار دیا ہے۔ اور اپنے جنگی قوانین میں انسانی ہمدردی اور نیک سلوک کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ آج کی مہذب دنیا میں قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی معاملات کرنا باعث شرم وعار نہیں سمجھا جاتا بلکہ ہر طرح سے زد وکوب کیے جانے اور جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیے جانے کو فتح وکامرانی کے نشے میں روا سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ کے جیلوں بلکہ اذیت کدوں سے متعلق دل خراش والم ناک داستانیں خود ساختہ تہذیب کے مدعیوں کے دعووں کو کھوکھلا ثابت کردیتی ہیں۔ اسلام ایسے غیر انسانی برتاؤ کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ایسے سلوک سے سختی سے منع کرتا ہے۔

عن ابی یعلی قال غزونا مع عبدالرحمن بن خالد بن الولید فاتی باربعة اعلاج من العدو فامربھم فقتلوا صبرا بالنبل فبلغ ذلک فقال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینھی عن قتل الصبر۔(۳۴)

ابو یعلی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے۔ دشمن کے چار جاسوس پکڑے گئے تو ان کے قتل کا حکم دیا اور ان کو باندھ کر تیر مار کر قتل کیا گیا۔ حضرت ایوب کو یہ بات پہنچی تو انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرماتے ہوئے سنا۔

پردہ داری کی تاکید: مجاہدین اسلام کو بلا اجازت گھروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ حالت جنگ میں بھی اسلام نے پردہ داری پر زور دیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

وان اللّٰہ تعالی لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا

اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جائز نہیں رکھا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں داخل

باذن ولا ضرب نساء هم ولا اکل ثمارهم۔(۳۵)

ہو جاؤ مگر اجازت سے نیز ان کی عورتوں کو پیٹنا اور پھلوں کو کھانا بھی حلال نہیں۔

صلح جوئی: اسلام صلح و آشتی کا علمبردار ہے اور معاشرہ انسانی میں خیر و فلاح کی قدروں کو فروغ دینا اس کا مطمح نظر ہے۔اسلام جنگ وجدال سے اجتناب کی بھی تلقین کرتا ہے، بلکہ امن کا قیام اس کی غایت منشودہ ہوتی ہے۔اسلام صلح جوئی اور قیام امن کی ترجیح، اس بات سے ظاہر ہے کہ اگر دشمنان اسلام کی طرف سے صلح کی پیش کش ہو تو اس کو رد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کو قبول کرنا ایمان کا جز ہے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (۳۶)

پس اگر وہ تم سے کنارہ کشی کر لیں اور تمہارے ساتھ جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کا پیغام بھیجیں تو اللہ نے تمہارے لیے (بھی صلح جوئی کی صورت میں) ان پر (دست درازی کی) کوئی راہ نہیں بنائی۔

اسلام میں جنگ کا جواز بحالت مجبوری ہے۔اگر صلح کا تھوڑا بھی رجحان ہے تو پھر صلح کو جنگ پر ترجیح حاصل ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (۳۷)

اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیے بلاشبہ وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے اور اگر وہ لوگ آپ کو دھوکہ دینا چاہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہے۔

اگر دشمنان اسلام بالکل مخالفت و عداوت پر اتر آئیں تو ان کی مخالفت اور نقض عہد کو دیکھتے ہوئے معاہدہ کو توڑا جا سکتا ہے، لیکن اس اقدام سے معاند و مخالف فریق کو خبردار کیے جانے کا حکم ہوتا ہے۔دھوکہ اور فریب بہرحال مذموم ہے۔اسی ضمن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ

اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو،

اِلَیۡهِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ (۳۸)

تو آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجیے کہ برابر ہو جائیں۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

جو قوم جنگ نہ کرے اس سے جنگ نہ کی جائے: کسی ملک سے اسلامی ریاست کو خطرہ نہ ہو امن و امان کا معاملہ بنا رہے تو اسلامی ریاست اس ملک و قوم سے بلا وجہ جنگ نہیں کر سکتی جیسا کہ حبشہ اور ترک کے معاملہ میں کیا گیا۔

دعو الحبشة ما ودعو کم واترکوا الترک ما ترکوکم۔(۳۹)

حبشہ کو چھوڑ دو جب تک کہ وہ تم سے تعرض نہ کرے اسی طرح ترک کو چھوڑ دو جب تک کہ انہوں نے تمہیں چھوڑ رکھا ہے۔

پناہ کے خواستگار کو پناہ دی جائے: زمانۂ جنگ میں کوئی غیر مسلم کسی حالت میں امن و امان یا پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دی جائے گی اگر چہ کسی فرد یا گروہ کو ایسی پناہ دینے کا اختیار صرف امیر کو حاصل ہے۔لیکن اسلام میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے حتیٰ کہ اگر کسی مسلمان عورت یا غلام نے بھی کسی کو پناہ دے دی تو وہ امان قابل قبول ہوگی۔(۴۰)

اسلام میں پناہ کا تصور کسی محدود دائرے میں محصور و مقید نہیں ہے بلکہ پناہ گزینوں کے جان و مال کا تحفظ حکومت وقت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔یہ ذمہ داری اس وقت تک ختم نہیں ہوتی ہے جب تک کہ پناہ گزیں نے کوئی ایسا جرم نہ کیا ہو جو قابل معافی نہ ہو۔مثلاً بغاوت و سرکشی یا اسلامی حکومت اور اس کے علمبرداروں کے خلاف جاسوسی کا عمل ناقابل برداشت ہے اس لیے کہ یہ فتنہ و فساد کے دائرے میں آتا ہے۔میدان جنگ میں بھی جب کہ دونوں فریقوں کے مابین قتال جاری ہو،اگر کوئی مخالف پناہ کا خواہاں ہو تو اسے پناہ دی جائے گی۔اگر وہ اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کو یہ تعلیم مہیا کی جائے گی۔اس کے بعد بھی اگر وہ اپنی سابقہ روش پر قائم رہنا چاہتا ہے تو اس پر جبر و اکراہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو حفاظت سے واپس کیا جا سکتا ہے۔

وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ اسۡتَجَارَکَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰی یَسۡمَعَ

اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے پناہ کا طالب ہو تو آپ اس کو پناہ دیجیے، تا کہ

كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡلَمُوۡنَ (۴۱) — وہ کلام الٰہی سن لے پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دیجیے یہ اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ نہیں جانتے۔

یہ حکم ربانی میدان جنگ میں نبرد آزما مشرکین سے متعلق ہے اس کی وضاحت ابن جریر طبری یوں کرتے ہیں:

> ’’جن مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے ان ہی کے بارے میں یہ بھی حکم ہے کہ ان میں سے کوئی اسلام کو سمجھنے کے لیے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دی جائے گی۔ اگر وہ اسلام کو قبول نہ کرے تو بہ حفاظت اسے اس کے علاقہ میں پہنچا دیا جائے گا۔ اسلامی ریاست کا کوئی فرد اس سے تعرض نہ کرے‘‘۔ (۴۲)

اسلامی اقتدار کے ہر دور میں اس قانون امن و امان کا پاس و لحاظ رکھا گیا۔ اگر کبھی کسی کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا گیا جو ظلم و تعدی کا مظہر ہے تو حقیقت یہ ہے کہ کسی حکمراں کا ذاتی عمل ہے۔ اسلام اور اس کی انسانیت نواز تعلیمات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام جس طرح اپنے نام سے امن و آشتی کا پیغام دیتا ہے اسی طرح قرآن و سنت کی واضح تعلیمات، ظلم و عدوان کی مخالف اور امن و آشتی کی نقیب ہیں۔ اسلام میں ایک انسان کا قتل ناحق پوری انسانیت کے قتل کے برابر اور ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کی جان بچانے کے برابر ہے۔ جو مذہب انسانی خون کے احترام میں ایسی اعلیٰ قدر کا نقیب ہو، اس سے دہشت گردی اور خوں ریزی کا انتساب سر تا پا ظلم ہے۔

حوالے و حواشی

(۱) سید محمد قطب: اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، ص: ۹۰ فرید بک ڈپو لمیٹیڈ۔ (۲) النساء: ۵۹۔ (۳) سنن ابی داؤد: کتاب الجہاد، باب فیمن یغزو و یلتمس الدنیا، حدیث ۲۵۱۵، ص: ۴۴۲، الالبانی۔ (۴) السنن ابن ماجہ: ابواب الجہاد، باب طاعۃ الامام، حدیث ۲۸۵۹، ص: ۴۸۵ الالبانی۔ (۵) السنن لابن ماجہ: باب طاعۃ الامام،

حدیث:۲۸۶۱،ص:۴۸۵،الالبانی۔(۶)النحل:۹۱۔(۷)الرعد:۲۱-۲۰۔(۸)بنی اسرئیل:۳۴۔(۹)سنن ابی داؤد:باب فی الامام یستجن بہ فی العھود،حدیث:۲۷۵۸،ص:۴۸۸،الالبانی۔(۱۰)سنن ابی داؤد:باب فی الوفاء للمعاہدوحرمتہ ذمتہ۔حدیث:۲۷۶۰،الالبانی۔(۱۱)سنن ابی داؤد:باب فی الامام یکون بینہ وبین العدو عہدفیسیر نحوہ' حدیث:۲۷۵۹،الالبانی۔(۱۲)الامام ابوالحسن البلاذری:فتوح البلدان،ص۵۳۔(۱۳)محمد: ۴۔(۱۴)الدھر:۸-۱۰۔(۱۵)الصحیح للبخاری:باب الطیب للجمعہ حدیث:۲۵۴۵۔(۱۶)جاداللہ محمود بن عمر الزمخشری:الکشاف عن حقائق التنزیل وغواض،ج۴،ص۱۹۶،دارالکتاب العربی بیروت،لبنان۔(۱۷)سنن ابی داؤد:باب فی النھی عن المثلۃ،حدیث۲۶۶۶،ص۴۶۸،الالبانی۔(۱۸)سنن ابی داؤد:حدیث:۲۶۶۷ الالبانی ص:۴۶۹۔(۱۹)مسنداحمد بن حنبل:حدیث سمرہ بن جندب،ج۵،ص۲۰۔(۲۰)سنن ابی داؤد:باب مایومرمن انضمام العسکر وسعتہ،حدیث ۲۶۲۹،ص:۴۶۱،الالبانی۔(۲۱)عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی: السنن، النسائی، باب النھی من التفرق فی الشعب والاودیۃ حدیث ۸۸۵۶ الالبانی۔(۲۲)السنن الترمذی:باب ماجاء فی النہی من قتل النساء والصبیان ،حدیث ۱۵۷۱،الالبانی۔(۲۳)الممتحنہ،۶۰-۸۔(۲۴)ابوالاعلیٰ مودودی:الجہاد فی الاسلام،ص۲۲۴۔(۲۵)الانفال:۷۲۔(۲۶)التوبہ:۴۔(۲۷)الصحیح للبخاری:باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورہ حدیث ۵۵۱۶۔(۲۸)السنن لابن ماجہ:باب النھی عن النھبہ حدیث ۳۹۳۷،البانی۔(۲۹)البقرہ:۲۰۵۔(۳۰)ابی جعفری محمد بن جریرالطبری:ج۲،ص۴۶۔بحوالہ صدیق اکبر،ص۳۲۹۔(۳۱)الصحیح البخاری:باب غزوہ خیبر،ج۲،ص۶۰۳،حدیث ۳۹۶۱۔(۳۲)الصحیح البخاری:من احب البناء قبل الغزو،کتاب النکاح،ص۷۷۵۔(۳۳)النمل،۲۷-۳۴۔(۳۴)احمد بن حنبل:مسنداحمد، ج۵،ص۴۲۲۔(۳۵)السنن لابی داؤد:باب فی تعشیر اہل الذمۃ،ج۲،ص۱۸۶،حدیث ۳۰۵۰،الالبانی۔(۳۶)النساء:۹۰۔(۳۷)الانفال:۶۲-۶۱۔(۳۸)الانفال:۵۸۔(۳۹)السنن لابی ابوداؤد:کتاب الملائم،باب فی النہی عن تہیج الترک والحبشہ حدیث:۴۳۰۴، الالبانی۔(۴۰)الصحیح البخاری،کتاب الجہاد،باب امان النساء،وجوارھن۔(۴۱)التوبہ:۶۔(۴۲)ابی جعفر محمد بن جریرالطبری:جامع البیان عن تاویل القرآن،جلد۱۴،ص۱۳۸،دارالمعارف،مصر۔

انگریز سامراج کی آمد سے قبل اور بعد کا ہندوستان

پروفیسر محمد انس حسان

اقوام وملل اور افراد وامم کے عروج وزوال کی تاریخ جتنی دلچسپ ہے، اتنی ہی دل خراش بھی ہے۔اس میں جہاں ایسی روایات نظر آتی ہیں جو سرمایۂ فخر وناز ہیں۔ وہاں ایسے اسباب وعلل اور واقعات وحقائق بھی ہیں، جو سامان عبرت مہیا کرتے ہیں۔اسی لیے باشعور اور ترقی کی آرزومند قومیں اپنی تاریخ کو غیر معمولی اہمیت دیتی ہیں اور اپنے ماضی کی روشنی میں مستقبل کی راہیں متعین کرتی ہیں(۱)۔اس تناظر میں اگر ہم برصغیر پاک وہند کی اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں تو موجودہ حالت زار کے بہت سے اسباب سامنے آسکتے ہیں۔تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں یہ خیال عام ہے کہ:

> ''کسی بھی دور کا تاریخی تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس دور کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی حالت وغیرہ کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس دور میں سماجی اور اجتماعی تقاضوں کی تکمیل کے عملی مظاہر کیا رہے''۔(۲)

تاریخ کا مطالعہ انفرادی نقطۂ نظر سے کیے جانے کی وجہ سے تاریخ کے اجتماعی مطالعہ سے محرومی ہوتی ہے۔ہمیں اپنی تاریخ شخصیات کی انفرادی سوانح معلوم ہوتی ہے، جس میں اقتدار کی رسہ کشی اور قتل وغارت گری کے سوا جیسے کچھ بھی نہیں ملتا۔اس نقطۂ نظر سے مایوسی اور نفرت کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک طویل زمانے سے ہمارے اہل علم تاریخ کو انفرادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں، انفرادیت پسندی کا یہ رجحان ہے جس نے

گورنمنٹ ڈگری کالج جہانیاں، پاکستان۔

ہمارے اہل علم کو اس طرف ڈال دیا ہے کہ وہ اسلام کی اجتماعی قوت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کا سارا زور افراد کی شخصیتوں کو اجاگر کرنے میں لگ جاتا ہے''۔(۳)

''بدقسمتی سے ہمارے مورخین نے تاریخ کو اجتماعی نظر سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ بحیثیت مجموعی کسی تحریک، حکومت یا اجتماع کو دیکھتے وہ حکمرانوں کی خانگی زندگیوں کے پیچھے پڑ گئے''۔(۴)

ایک اور غلط رجحان یہ ہے کہ تاریخ کا تجزیہ موجودہ دور کے مدنظر کیا جاتا ہے۔ جب کہ ہر دور کے حالات اور تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان سماجی تقاضوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسلامی تاریخ کا دورانیہ محض تیس سال بتایا جاتا ہے اور ان تیس سالوں کے علاوہ اسلامی تاریخ کے دامن میں خوں ریزی کے سوا جیسے کچھ بھی نہیں۔ اگر یہ درست ہے تو آخر مسلمانوں کا نظام حکومت ۱۲۰۰ر سال تک کس طرح قائم و دائم رہا۔؟

ہمارے نزدیک مطالعہ تاریخ کے مروجہ نظریات انگریز سامراج کے اس نوآبادیاتی دور کی یادگار ہیں، جس کا ایک مقصد مسلمانوں کو ان کی تاریخ سے نفرت و بیزاری اور نئے سامراجی اقتدار کے لیے سند جواز فراہم کرنا تھا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انگریز سامراج کی آمد سے قبل یہ خطہ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے انتہائی ترقی کا حامل تھا یہ انگریز سامراج تھا جس نے اس خطے کی فکری وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۱ء میں ہندوستان میں آئی (۵)۔ تاہم اس کمپنی کی بنیاد اس سے بہت پہلے پڑ چکی تھی (۶) یعنی:

''۱۳ر سالہ اکبر کے برسر حکومت آنے کے چار سال بعد ۱۵۵۶ء میں کچھ متمول انگریز تاجر لندن میں اکٹھے ہوئے، آپس کی اس مشاورت کے نتیجہ میں مسکووی کمپنی بن گئی جو دنیا کی پہلی جوائنٹ اسٹاک کمپنی تھی۔ اگرچہ اس زمانہ میں اسے چارٹرڈ کمپنی کہا جاتا ہے''۔(۷)

انگلش پارلیمنٹ میں ایک قانون منظور کیا گیا اور ملکہ الزبتھ اول نے ۱۶۰۰ء میں ایک

میثاق کی منظوری دے کر ''آنریبل کمپنی آف لندن مرچنٹس'' کو ہندوستان میں ۱۵ سال تک تجارت کی اجازت دے دی۔

''ملکہ الزبتھ کے عہد میں انگریز تاجروں نے ہندوستان سے تجارتی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ہندوستان کی تجارت پر ولندیزوں کا قبضہ تھا۔ انگریزوں اور ولندیزوں میں مشرق کی تجارت کے لیے باہمی لڑائی ایک یقینی بات تھی۔ تاجروں کے جہازی قافلے ایک دوسرے کو لوٹ لینا تجارت خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے تجارت کے لیے بہت سے تاجر مل کر کمپنی بناتے اور حکومت سے تجارت کرنے کے لیے فرمان حاصل کرتے''۔(۸)

سترہویں صدی کے آغاز میں ولندیزوں اور انگریزوں کے بعد کچھ فرانسیسی تاجروں نے بھی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سیاسی اور معاشی مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے تو ہندوستان میں بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑنے لگے(۹)۔ اس لڑائی نے ہندوستان میں فرانسیسی سامراج کی سیاسی حیثیت ختم کردی۔ اگرچہ ہندوستان میں کمپنی کی آمد ۱۶۰۱ء میں ہوئی مگر ابتدا میں ان کے اثر ورسوخ کا دائرۂ کار انتہائی محدود تھا۔ سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان میں اس وقت جہاں گیر تخت سلطنت پر رونق افروز تھا۔ جب انگریزی سفیر مسٹر ہاکنس دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے اس کا خیر مقدم فراخ دلی کے ساتھ کیا۔ لیکن اسے پرتگالیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اپنے مقصد میں حسب دل خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ صرف اس قدر ہوا کہ ۱۶۰۸ء میں سورت میں کوٹھی قائم کرنے کی اجازت مل گئی اور اسی ۱۶۰۸ء سے ہندوستان میں کمپنی کا تجارتی دور شروع ہوا''۔(۱۰)

ہندوستان نے ان اجنبی تاجروں کی خاطر مدارات کی۔ یہاں کے تاجروں نے لین دین، معاملات اور قرض کے حوالے سے انہیں کبھی پریشان نہ ہونے دیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بہت

جلد سورت کے علاوہ احمد آباد، برہان پور، اجمیر، آگرہ وغیرہ میں کمپنی کے گودام بن گئے اور اس کے ملازم لاکھوں کا لین دین کرنے لگے پھر اپنے مال واسباب کی حفاظت کے لیے فوج رکھنے کا جواز فراہم کیا گیا اور کوٹھیوں کو فوجی چھاؤنیوں کی شکل دے دی گئی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ کمپنی کے ابتدا میں کچھ سیاسی مقاصد بھی تھے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کمپنی نے ہندوستان کی سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کردیا۔

> ''کمپنی بہت جلد تجارت کے ساتھ سیاست کے میدان میں بھی اتر پڑی اب اس کے پیش نظر تجارت اور ملک گیری تھی''۔(۱۱)

سر تھامس منرو نے ایک بار کہا تھا کہ:

> ''اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب وتمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچے گا''۔(۱۲)

لیکن اسی تہذیب وتمدن کے حامل سماجی، معاشی، سیاسی، تجارتی اور صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ اور خوش حال خطے کو اس طرح بدحال اور ابتر کردیا گیا کہ آج تک اس کے اثرات محسوس کیے جارہے ہیں۔

> ''انگریز دور کے ظلم وانتقام کی حشر انگیز کارروائیاں ایسی ہیں، جنہیں تاریخ کے صفحات سے کھرچ کر پھینکا نہیں جاسکتا۔ ان کے ظلم وانتقام نے نفرت و تشدد وقتل وغارت گری کے ایسے بیج بوئے کہ آج ہماری نسلیں اسی کی فصل کاٹ رہی ہیں۔ ہماری سماجی ساخت میں فرقہ واریت، تشدد، دہشت گردی، نفرت، تقسیم در تقسیم کے رویے اسی دور غلامی اور جبر واستحصال کی پیداوار ہیں''۔(۱۳)

برصغیر میں مسلمان قلیل تعداد کے باوجود ایک طویل عرصہ تک محض اس بنیاد پر حکمراں رہے کہ انہوں نے فکری اور طبقاتی لحاظ سے منتشر اس خطے کو ایک وحدت دی۔ ایک ایسا خطہ جہاں بے شمار زبانیں اور بولیاں ہوں، مذاہب کی کثرت ہو اس میں تہذیبی وحدت پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مسلمانوں کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ:

> ''اکبر نے اپنے دربار میں عیسائیوں کو آنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اس کے عبادت خانے میں جو مباحث ہوتے تھے ان میں عیسائی پادری بھی شریک ہوتے وہ دربار میں انجیل بھی لاتے، اکبر نے اس کا ترجمہ فارسی میں بھی کرایا''۔(۱۴)

اکبر کی خواہش ہندو مسلم اتحاد کی تھی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ برعظیم میں امن و امان اور مساویانہ ترقی محض اسی صورت میں ممکن ہے کہ طبقاتی اور مذہبی رواداری ہو۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک کونسل سے خطاب کرتے ہوئے اکبر نے کہا تھا کہ مابدولت کی خواہش ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کیا جائے اور ہر فرقے کو یہ تعلیم دی جائے کہ وہ دوسرے مذاہب کی اچھائیوں کو نظر انداز نہ کرے۔ اس طرح خدا بھی خوش ہوگا اور ملک میں امن و امان بھی قائم ہو جائے گا''۔(۱۵)

مسلمانوں نے برعظیم کی دیگر قوموں سے فاتح و مفتوح والا سلوک نہیں کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ولیم نے ۱۸۹۲ء میں کہا تھا کہ:

> ''بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں، انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں۔ مسلمان اس ملک میں آباد ہو گئے، جسے انہوں نے فتح کیا تھا۔ وہ ہندوستانی باشندوں میں گھل مل گئے۔ ان میں بیاہ شادی کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیے۔ فاتح و مفتوح کے مذاق، دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرقہ نہ تھا''۔(۱۶)

اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانے میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لیے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔(۱۷) بقول بابو سندر لال:

> ''ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے

پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں۔جن میں خیرات اور جاگیروں کے
عطا کیے جانے کا تذکرہ ہے''۔(۱۸)

برعظیم میں مذہبی رواداری کے فروغ میں مسلم حکمرانوں کے ساتھ ساتھ اولیائے کرام کی فکر کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔اسی لیے انگریز سامراج نے برصغیر میں مذہبی فرقہ واریت کو پھیلانا چاہا تو البوکر یک نے لکھا کہ:

''ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے لوگ ایک دوسرے سے اس قدر
قریب ہیں کہ انہیں الگ الگ نہیں کیا جاسکتا''۔(۱۹)

مولانا سید محمد میاں نے لکھا کہ:

''بلاشبہ شاہ جہاں کا طرز قابل صد تحسین ہے کہ پابندی مذہب کے باوجود
اس نے جائز رواداری سے ہندو اور مسلمانوں کو ایک جان بنا رکھا تھا''۔(۲۰)

مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کو بھی انتہائی اہم عہدے تفویض کیے۔اکبر نے ہندوؤں کو نظام سلطنت میں شامل کیا۔اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا۔یہاں تک کہ خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا، وہ ہندو راجپوت تھا(۲۱)۔ٹیپو سلطان کا معتمد سردار پورنیاں برہمن تھا اور والی بنگال کا وزیر اعظم موہن لال اور پٹنہ کا حاکم رام نرائن تھا(۲۲)۔ اورنگ زیب عالم گیر کی پالیسی تھی کہ سلطنت کے کاروبار میں مذہب کو دخل نہ دینا چاہیے۔شاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملنی چاہئیں۔(۲۳)

مسلم حکمرانوں کے درباروں میں آزادی رائے کا مکمل حق حاصل تھا۔آج کل کی جمہوریت کے ایوانوں میں ایک عام انسان کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔لیکن مسلم حکمرانوں کے درباروں کی حالت سر برٹل کے مطابق کچھ ایسی تھی:

''ایک اچھے حکمران کے زیر اثر اس دربار میں سب کی رسائی ہوتی
ہے اور ہر ایک کو تقریر کرنے کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے اور یہی ذریعہ ہے
جس سے وہ رعایا پر کسی قانون کے اثر کو محسوس کرسکتا ہے اور وہ اس طرح بے چینی
کو پہلے ہی معلوم کر لیتا ہے''۔(۲۴)

برعظیم چونکہ معاشی طور پر خوش حال تھا اس لیے اس کے اثرات لوگوں کے اخلاق میں بھی نمایاں تھے۔ یہاں کے باشندے اقوام عالم میں بلند اخلاق، اعلیٰ کردار اور نیک سیرت کے مالک تھے۔ اس حوالے سے کرنل سلیمان اپنے تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر لکھتا ہے کہ:

"میرے تجربے میں صدہا مثالیں ایسی آچکی ہیں کہ ایک آدمی کی دولت، آزادی اور زندگی جھوٹ بولنے سے بچ سکتی تھی، مگر وہ جھوٹ ہی نہ بولا"۔ (۲۵)

لیکن انگریزوں کی عمل داری کا رنگ کیا تھا؟ ملاحظہ ہو مولانا حسین احمد مدنی کی یہ تحریر کہ:

"گوروں کے مقدمات ہندوستانی ججوں کے یہاں فیصل نہ ہو سکتے تھے۔ ریل کے ڈبوں میں ہندوستانی اور یورپین کا تمیز کیا گیا۔ شاہراہوں اور تفریح کے مقامات میں ان کا تمیز کیا گیا، بیرون ہند، ہندوستانیوں کو وحشی، نیم تعلیم یافتہ، جاہل، غیر مہذب، قلی وغیرہ مشہور کیا گیا۔ ان کو غیر قابل حکومت، ناسمجھ، نالائق بتلا کر نا قابل آزادی بتلایا گیا۔ ان کو مذہبی دیوانے، کنگال لڑا کو دکھلایا گیا"۔ (۲٦)

انگریز سامراج نے اس خطے میں سماجی ومذہبی طبقاتی انتشار اور فرقہ واریت کو فروغ دیا۔

"اس (انگریز سامراج) نے برصغیر کو اپنی سامراجی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بعض سائنسی ترقیات سے ضرور متعارف کرایا لیکن سماجی، سیاسی، معاشی اور فکری سطح پر اسے بانجھ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جس کے نتیجے میں برصغیر کو تنگ نظری، منفی جذبانیت، انتہا پسندی، بنیاد پرستی، فرقہ واریت، غربت و افلاس، جہالت و وحشت جیسے کئی امراض نے گھر کر لیا اور بنی آدم باہم دگر گتھم گتھا ہو گئے جس کے علاج کے نام پر برصغیر کے نقشے پر آڑی ترچھی لکیریں ڈال کر اسے اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ نئے تنازعات نے پرورش پانا شروع کر دیا"۔ (۲۷)

ہندو مسلم فسادات اور مذاہب میں متعدد مسالک کو جنم دے کر انگریز سامراج نے اپنی حکومت کی مدت دراز کی۔ بقول ہنٹر:

"(ہندو مسلم فسادات کا) یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ

> ہوسکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں تمام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی''۔(۲۸)

کسی بھی ملک کی صنعت و معیشت اس ملک کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔انگریز سامراج کی آمد سے قبل یہ خطہ صنعتی و معاشی لحاظ سے اس قدر خوش حال و ترقی یافتہ تھا کہ اسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔گیارہویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان تجارتی و صنعتی اعتبار سے بہت نمایاں تھا۔اس دور میں انگلستان سے جاپان تک ہندوستانی مال فروخت ہوتا تھا۔دور حاضر کے بیشتر یورپی ممالک اس خطہ کی صنعتی و تجارتی منڈیاں تھے۔ ہندوستان کی صنعتی برتری کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسے ختم کرنے میں سولہ سال صرف ہوئے (۲۹)۔انگلستان کے لیے تجارتی اور جنگی جہاز ہندوستان میں تیار ہوتے تھے (۳۰)۔ ولیم ڈگبی کے مطابق بمبئی میں جو جہاز بنتے ہیں،ان پر انگلینڈ کی بہ نسبت پچیس فی صد کم لاگت آتی ہے۔(۳۱)

یہاں (برصغیر) میں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت و حرفت کے کاروبار تھے(۳۲) لائق اور کاری گر صناع موجود تھے(۳۳)۔سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک و نفیس و خوب صورت بنتے تھے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی ان کی برابری نہ کرسکتا تھا(۳۴) ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک روئی اور ریشم کا کپڑا یہاں بکثرت تیار ہوتا تھا(۳۵)۔مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے کپڑے کی صنعت کے حوالے سے لکھا ہے کہ حسن و باریکی میں ان کپڑوں کی حالت یہ تھی کہ ایک انگوٹھی میں پورا تھان سما سکتا تھا (۳۶)۔آہن گری کی صنعت انتہائی عروج پر تھی۔ رناڈلے کے مطابق دہلی کی مشہور لوہے کی لاٹ سے لوہا ڈھالنے کی صنعت کا اندازہ ہوتا ہے(۳۷)۔لندن میں فولاد ہندوستان کے نام سے فروخت کیا جاتا تھا(۳۸)۔مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان قدیم زمانے سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا۔ یہاں ہر قسم کی اعلیٰ اور ادنیٰ صنعتوں کے بے شمار کارخانے قائم تھے۔جن سے ملکی ضروریات اور ذرائع ترقیات پوری ہوتی تھیں اور تمام دنیا کے ممالک نفع حاصل کرتے تھے۔ بیرونی ملکوں سے ہر سال کروڑوں اشرفیاں انہیں مصنوعات کی قیمت میں ہندوستانی تاجر حاصل کرتے تھے اور ہندوستانی باشندے کروروں آدمیوں کی

تعداد میں یہاں کی صنائع اور تجارتوں کے ذریعہ سے آرام اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے''۔(۳۹)

ایچ ایچ ولسن کے الفاظ میں:

''ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے اس وقت تک برطانیہ کے بازاروں میں ولایتی کپڑے سے ارزاں بکتے تھے۔ ہندوستانی مال کی قیمت ولایتی مال سے پچاس سے لے کر ساٹھ فی صد تک کم ہوتی تھی مگر اس پر بھی ہندوستانی کپڑے کی تجارت میں فائدہ رہتا تھا''۔(۴۰)

محمد تغلق نے دہلی میں سوتی کپڑے کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا، جس میں پانچ ہزار کاریگر کام کرتے تھے(۴۱)۔ اورنگ زیب کے عہد میں سورت اور احمد آباد سے جو مال باہر بھیجا جاتا تھا اس سے (اس وقت کے) تیرہ لاکھ اور ایک سو تین روپے سالانہ چنگی کے ذریعہ وصول ہوتے تھے(۴۲)۔ کپڑا سازی کی صنعت اس درجہ قدیم تھی کہ فراعنۂ مصر کے مقبروں میں ان کی نعشیں ہندوستان کے باریک ململ میں لپٹی ہوئی پائی گئیں(۴۳)۔ مسٹر بالکفین کے مطابق ہندوستانی کپڑے نے ہمارے اُونی کپڑے کا کام تمام کردیا اور اپنے مقابل دیگر ممالک کے کپڑے کی درآمد انگلستان میں روک دی(۴۴)۔ اس صنعتی ترقی نے انگریز سامراج کو اتنا حواس باختہ کردیا تھا کہ اپنی پارلیمنٹ میں درخواست گزاردی کہ اگر ہندوستانی کپڑا نہ روکا گیا تو یہ صنعت انگلستان میں بالکل تباہ ہوجائے گی۔(۴۵)

انگریز مورخین برصغیر کے موجودہ زرعی حالات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے زرعی لحاظ سے ترقی یافتہ تھا۔ یہ صحیح بھی ہے مگر اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صنعتی لحاظ سے یہ خطہ غیر ترقی یافتہ تھا۔ مولانا مدنی نے اس دلیل اور اس رائے کا مکمل رد کیا ہے اور اسے انگریز مورخین و مصنّفین کا پروپیگنڈا قرار دیا ہے(۴۶)۔ ایک اور قول ہے کہ:

''آج ہندوستان کو صرف زرعی ملک کہا جاسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے شروع تک ہندوستان ایک صنعتی ملک تھا۔ دنیا کے ہر ملک کے تاجر ہندوستان سے تجارت کرتے تھے''۔(۴۷)

انگریز سامراج کی آمد سے قبل برصغیر کے تاجر خوشحال تھے۔بعض تاریخیں بتلاتی ہیں کہ ۱۷۷۲ء میں صرافوں کی دوکانوں پر اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے ہوتے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں(۴۸)۔محمد تغلق کے دور میں بیس ہزار آدمی شاہی مہمان خانہ میں کھانا کھایا کرتے تھے(۴۹)۔صرف دہلی میں ستر شفا خانے عام لوگوں کے لیے دن رات کام کرتے تھے اور دو ہزار مسافر خانے مسافروں کے لیے کھلے رہتے تھے(۵۰)۔مسافروں کے جانوروں کا کھانا بھی (مسافر خانوں) کے ذمہ تھا(۵۱)۔بنگال میں صرف دریائے ہگلی سے ۵۰ تا ۶۰ جہاز مال سے بھرے ہوئے سالانہ تجارت کے لیے بیرون ہند بھیجے جاتے تھے(۵۲)۔چیزیں اتنی ارزاں اور کم قیمت تھیں کہ آج سن کر حیرت ہوتی ہے۔مولانا گیلانی نے ابن حوقل (سیاح) کے حوالے سے لکھا ہے:

> ’’شہد، گھی، اخروٹ، کشمش، الغرض کھانے پینے کی ساری چیزیں اتنی ارزاں ہیں کہ گویا مفت مل جاتی ہیں‘‘۔(۵۳)

برصغیر کے حکمرانوں کی معاشی خوشحالی کا ذکر تو کتابوں میں ملتا ہے مگر اس عہد کے عام تاجروں کے مالی گوشواروں کا علم زیادہ تر لوگوں کو نہیں ہے۔صاحب مآثر الامراء کے مطابق سورت کے تاجر ملا عبدالغفور جو عالم گیری عہد کے تاجر ہیں،ان کا سرمایہ کروڑوں روپیہ سے متجاوز تھا(۵۴)۔عالم گیر کا بیٹا مراد بخش جو گجرات کا گورنر تھا اس کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ حاجی پیر محمد زاہد علی سے ایک دفعہ چھ لاکھ قرض شہزادے نے لیا۔(۵۵)

مغلوں کے دور میں ساری زمین ریاست کی تھی اور اسے مختلف افراد کو مقررہ مقاصد کے تحت دیا جاتا تھا۔کارل مارکس نے بھی اپنی کتاب داس کیپٹل میں برعظیم کی زمینوں کی قومی ملکیت کو اپنے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے(۵۶)۔مغل سربراہوں نے زراعت کو فروغ دینے کے لیے ایسے زرعی قوانین وضع کیے کہ ترقی کی راہ پر گامزن صنعت کے لیے خام مال اور عوام کے لیے خوراک کی بہم رسانی نہایت آسان ہوگئی(۵۷)۔کسی قسم کا مالیہ اور محصول ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔سرکاری زمین ہونے کی وجہ سے انتہائی معمولی لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔اس خوشحالی کی وجہ سے کسان میں تجربات اور اختراعات کی سوچ پیدا ہوتی(۵۸)۔مولانا گیلانی نے شیخ مبارک (سیاح) کے

حوالے سے لکھا ہے کہ:

”اس ملک (برصغیر) میں چاول ہی صرف اکیس قسموں کا پیدا ہوتا ہے“۔(۵۹)

برصغیر کا کسان خوشحال، باشعور اور انتہائی اچھے حالات میں تھا۔ وہ زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کی پوری کوشش کرتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اجناس کی فراوانی نے عوام میں مہنگائی اور غربت کے خدشات ختم کر دیے۔

لیکن انگریز سامراج کے آنے کے بعد اس خطے کی صنعتی، معاشی، تجارتی اور زرعی صورت حال یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی۔ وہ انگریز سامراج جس نے ۱۶۰۱ء میں محض تیس ہزار پاؤنڈ سے تجارت شروع کی صرف ساٹھ برس کے بعد اس قدر دولت مند ہوا کہ انگلستان کے بادشاہ کو تین چار لاکھ پاؤنڈ بطور نذرانہ پیش کیا (۶۰)۔ جب نذرانہ ہی لاکھوں پاؤنڈ ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوٹ کھسوٹ کتنی کی گئی ہوگی۔ انگریز سامراج نے ”ایسٹ انڈیا کمپنی“ کے نام سے اس خطے میں پہلی مرتبہ صنعتی اداروں میں مزدور اور مالک کے مروجہ ظالمانہ نظام کو متعارف کرایا۔ مزدوروں کو معمولی مزدوری اور مالکان کو بڑی تنخواہوں پر رکھ کر ان میں رقابت اور نفرت کے جذبات پیدا کیے گئے۔ مولانا مدنی لکھتے ہیں کہ:

”کمپنی کے وہ ملازم جو ہندوستان میں خرید و فروخت پر مقرر تھے چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پاتے تھے۔ فیکٹری کے صدر کو تین سو پونڈ سالانہ ملتے تھے جو کہ سب سے اونچی تنخواہ تھی۔ محرروں اور دوسرے ملازمین کو دس سے لے کر چالیس پونڈ سالانہ تک دیے جاتے تھے۔ ان تنخواہوں پر بھلے مانس اور شریف لوگ کاہے کو اپنا گھر بار چھوڑ کر آتے“۔(۶۱)

اے۔ جی ولسن کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۸۲ء تک آتے آتے یہاں کے باشندوں کی اوسط آمدنی پانچ پاؤنڈ سالانہ ہوگئی (۶۲)۔ جبکہ تین کروڑ پاؤنڈ سالانہ اس خطے سے انگلستان منتقل کیا جاتا رہا۔ سامراج کی اس حکمرانی نے صنعت و حرفت کو مفلوج کر دیا۔ مزید برآں محصولات اور ٹیکس کے بوجھ نے کاروباریوں کی کمر توڑ دی۔ سرمایہ داریت اور بنیادی انسانی حقوق

پامال کردیے گئے اور حالت یہ ہوئی کہ لالہ لاجپت رائے کے مطابق جنوبی ہندوستان میں غربت و افلاس کی وجہ سے لوگ مُردار گوشت کھا کر زندگی گزارنے لگے (۶۳)۔ وہ ہندوستان جس کی خوشحالی مثالی تھی، اے۔اے برسل (ممبر پارلیمنٹ) کے مطابق اب اس حال میں تھا کہ یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جسے اپنی پیدائش سے لے کر موت تک کبھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا (۶۴)۔ مسلسل فاقہ کرنے والوں کی تعداد چار کروڑ سے سات کروڑ تک پہنچ گئی۔(۶۵)

اس مہنگائی اور گرانی کے اسباب مولانا مدنی نے یوں گنائے:

(الف) یہاں کے نقود اور سونے چاندی کو لوٹ کر انگریزوں نے انگلستان پہنچایا وہاں ان سے بڑے بڑے بینک کھولے گئے۔ ملیں اور مشینیں قائم کی گئیں اور ہندوستان سے خام اشیاء کو کھینچ کر انگلستان پہنچایا گیا۔

(ب) انگلستان میں ہندوستانی مال پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس اور قانونی پابندیاں قائم کی گئیں اور ہندوستانی مال کو انگلستان سے نکال باہر کیا گیا۔

(ج) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کو مٹایا گیا۔

(د) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کے بند اور قریب مرگ ہوتے ہی فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کی پالیسی کا اعلان کیا گیا اور ہر قسم کے مصنوعات اور تجارتی اشیاء کو نہایت معمولی اور کم سے کم ٹیکس کے ساتھ ہندوستان میں لا کر ہندوستان کو یورپین بالخصوص انگریزی مال کی منڈی بنا دیا گیا۔

(ر) ہندوستان سے غلہ نہایت فراوانی سے جہازوں میں بھر بھر کر انگلستان اور دیگر ممالک بھیجا گیا۔(۶۶)

حقیقت یہ ہے کہ:

> ''سنگ دل اور خود غرض انگریز نے انتہائی جابرانہ طریقوں سے صنعت و حرفت کو مٹانے کے لیے وحشیانہ مظالم ڈھائے اور آخر ایک دن وہ آیا کہ برصغیر کی صنعتی حالت بالکل پست ہو کر رہ گئی''۔(۶۷)

برصغیر کی صنعت و حرفت کی تباہی کا دور انگلستان کی صنعت و معیشت کی ترقی کا دور بن

گیا۔ کپڑے کی صنعت جس نے ایک دور میں انگریز تاجروں کو مفلسی کے غم میں مبتلا کر رکھا تھا (۶۸)۔منصوبہ بندی کے تحت اس کا استحصال کیا گیا (۶۹)۔طریقۂ کار یہ اپنایا گیا کہ خام مال باہر لے جا کر تیار کیا گیا۔(۷۰)

''وہ سرمایہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی تجارت سے پیدا کیا تھا، انگلستان میں صنعتی انقلاب کا سبب بنا''۔(۷۱)

یہ خطہ جو صنعت وتجارت میں شہرت رکھتا تھا محض زراعتی ملک بنا دیا گیا (۷۲)۔ چونکہ صنعت وحرفت کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے اس لیے لوگ زراعت کی طرف متوجہ ہوئے (۷۳)۔لیکن معاملہ یہ ہوا۔انگریز سامراج نے اپنے وفاداروں کو بڑی بڑی جاگیریں دے کر خطے میں طبقاتی کشمکش پیدا کی۔محاصل اور زرعی ٹیکسوں کی بھرمار کی۔ پیداوار کم ہونے کے باوجود لگان کی شرح میں بتدریج اضافہ کیا جاتا رہا جس سے کسان کی زندگی دوبھر ہو کر رہ گئی۔جی کر ہارڈی کے مطابق ۱۸۱۷ء میں جبری لگان کا طریقہ رائج کیا گیا۔(۷۴) مولانا مدنی نے لکھا کہ:

''لگان کے ثقیل بوجھ اور وصولی کے انتہائی جابرانہ طریقہ کی وجہ سے کسان ہر سال زمین جوتنے پر مجبور تھا، زمین کو لگاتار بوتا تھا اور اپنی گلوخلاصی کی فکر کرتا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کی زمین انتہائی درجہ کمزور ہو گئی اور پیداوار میں نہایت زیادہ کمی ہو گئی''۔(۷۵)

آسام کے کمشنر چارلس ایلیٹ کو لکھنا پڑا کہ:

''میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشت کاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کسے کہتے ہیں''۔(۷۶)

اقتصادی اور معاشی بربادی سے عوام کی اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں کند ہونے لگیں۔سماجی فساد اور جرائم نے جنم لیا۔ایجادات واکتشافات کی جگہ پیٹ بھرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔اجتماعی ترقی کی جگہ انفرادیت پسندی اور خودغرضی نے لے لی۔صنعتی تباہ حالی اور زرعی استحصال نے لوگوں میں قدروں کو ہوا دی اور اس نوآبادیاتی نظام کو استحکام بخشا۔

معاشرے کے ارتقاء اور تہذیب وتمدن کے فروغ میں سیاسی بالادستی اور علمی ترقی کا

بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ سیاسی طاقت کے بغیر سوسائٹی کی اجتماعی ترقی اور اقتصادی خوشحالی ممکن نہیں۔ ہمارے بعض مورخوں نے اس نقطۂ نظر کو عام کرنے کی کوشش کی ہے کہ عالم اسلام کے خلفاء نے بالعموم اور برصغیر کے حکمرانوں نے بالخصوص عیش وعشرت اور اپنے ذوق کی تسکین کے لیے عمارتوں کی تعمیر کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔ اس نقطۂ نظر نے اسلام کے بطور سیاسی نظام ہونے کے نظریے کو بری طرح مسخ کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ یہ مطالعہ تاریخ کا وہ انفرادی نقطۂ نظر ہے جس سے مایوسی اور اپنے تابناک ماضی سے نفرت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس بات سے انکار نہیں کہ بہت سے حکمرانوں کا ذاتی کردار کئی حوالوں سے مستحسن نہیں رہا، نیز ماضی کی تابناکی کے گُن گانا اور حال کی فکر نہ کرنا بھی کوئی اچھا عمل نہیں لیکن مسلمانوں کے دور زوال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ سیاسی بصیرت سے نابلد اور قطعی ناواقف تھے بالکل درست نہیں۔ اس کی شہادت ڈبلیو۔ڈبلیو ہنٹر نے بھی دی ہے، لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان قوم ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھی بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھی''۔(۷۷)

برصغیر کے حکمرانوں نے مختلف النوع لوگوں کے مابین باہمی تعلقات میں ایسا توازن قائم کیا کہ مذہبی، لسانی اور تہذیبی اختلافات کے باوجود یہ خطہ پر امن، ترقی یافتہ اور خوش حال رہا۔ بہتر سیاسی نظام نے پوری قوم کو بلاامتیاز رنگ، نسل اور مذہب مساوی طور پر ترقی کی راہ گامزن کردیا۔

> ''مسلمان حکمرانوں نے غالب ہونے کے باوجود دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو بھی سیاسی نظام میں اس طرح شریک کیا کہ فریقین کے مابین حائل اجنبیت کا خاتمہ ہوگیا''۔(۷۸)

مسلم حکمرانوں کی وسیع النظری اور مذہبی رواداری نے ایک فکری وحدت سے روشناس کرایا۔ مسلم حکمراں قانون سازی میں شریعت کا خیال کرتے تھے۔ اگر وہ خلاف شرع کام کرتے تو علمائے حق اور صوفیائے کرام کی شکل میں ایک مضبوط اپوزیشن موجود تھی۔ ایک انگریز محقق نے لکھا ہے کہ:

''اس قانون (قرآن وسنت) کی شرح کرنے والے علماء یا قاضی کا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہ کی ناراضگی سے محفوظ ہے اور جسے بادشاہ ہاتھ نہیں لگا سکتا اور ان کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے، بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے''۔(۷۹)

عدل وانصاف کے لیے مسلم حکمرانوں نے تین طریقے رائج کیے:

۱- بادشاہ کی طرف سے براہ راست عدل کی فراہمی۔ ۲- شہری سطح پر عدالت کی طرف سے انصاف کی فراہمی۔ ۳- گاؤں کی پنچایتوں کی طرف سے انصاف۔

اس تمام عمل میں رعایا کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا تھا۔

مسلم حکمرانوں نے ریاست کو اقتصادی حوالے سے انتہائی اعلیٰ مقام دلایا، ملک میں سرمایہ کاری کی اور ملک کی دولت باہر لے جانے پر پابندی عائد کردی۔ ابن بطوطہ کے مطابق:

''شاہ تغلق اپنے ملک سے باہر روپیہ لے جانے کی کبھی اجازت نہ دیتا اور مشہور تھا کہ اگر کوئی شخص کبھی روپیہ لے جاتا تو ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں پڑ جاتا''۔(۸۰)

فوجی لحاظ سے بھی مسلم حکمراں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اگرچہ ہمارے بعض مورخین کی نظر میں مسلم حکمراں زیادہ تر سازشوں کو فرو کرنے میں لگے رہتے اور اقتدار کے حصول کے لیے اپنے اور غیر کے خون میں کوئی فرق روا نہ رکھتے تھے۔ حالانکہ میدان جنگ میں اترنے کا مقصد ریاست کی وحدت کو قائم رکھنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دور استحکام میں طوائف الملوکی کا نام ونشان نہ تھا۔ عسکری قوت کو بھی فوج اور پولیس کے شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جو داخلی اور خارجی محاذوں پر ریاست اور رعایا کی جان ومال کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔ سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں کہ:

''جان ومال کی حفاظت کے اعتبار سے ہندوستان دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہ تھا اور یہ امر کسی کے ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا کہ کوئی شخص اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے ہتھیار نہ رکھ سکے۔ ملک کی حفاظت کے لیے ہزارہا قلعے بنے ہوئے تھے''۔(۸۱)

ریاست میں مجموعی اعتبار سے امن وامان رہتا اور اگر کسی سازش یا بغاوت کے لیے فوج کشی کرنا پڑتی تو اس کا اثر رعایا پر نہیں پڑنے دیا جاتا تھا۔ مذہبی لحاظ سے فرقہ واریت اور تشدد کی اجازت نہ تھی۔ ایسی سیاسی آزادی تھی جس نے رعایا کو سماجی لحاظ سے متمدن اور معاشی لحاظ سے خوش حال بنا دیا۔

علمی صورت حال بھی بہت اچھی تھی۔ دور عروج میں دینی و دنیاوی تعلیم کا امتیاز نہیں تھا بلکہ ہر دو طرح کی تعلیم ایک ہی ادارہ میں دی جاتی تھی۔ وہ نصاب تعلیم جسے ملا نظام الدین سہالوی نے ترتیب دیا تھا، اس میں ۵۶ علوم شامل تھے (۸۲)۔ ان علوم میں منطق، فلسفہ، ریاضی، طب، فن تعمیر، جیومیٹری، علم ہندسہ اور علم فلکیات کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام اور تصوف جیسے علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان تمام علوم کے حصول کا دورانیہ ۸ سال رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ وسعت اور جامعیت غالباً دنیا کے کسی اور مذہب یا روایت میں نہیں ہے کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں یہ سب تکمیل پا جائے''۔ (۸۳)

مسلم حکمرانوں نے ذاتی طور پر علوم وفنون کی ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ صرف دہلی شہر میں ایک ہزار جامعات موجود تھیں (۸۴)۔ ان جامعات اور ان کے اساتذہ کے اخراجات کی مکمل ذمہ داری ریاست کے ذمہ تھی۔ اساتذہ معاشی لحاظ سے خوشحال تھے۔ محمد تغلق کی علم دوستی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اس وقت تک دسترخوان پر نہیں بیٹھتا تھا جب تک کم از کم چار سو علماء وفقہاء اس کے دسترخوان پر موجود نہ ہوں (۸۵)۔ والیان اور امرائے ملک تعلیم کی مکمل سرپرستی کرتے تھے۔ صرف روہیل کھنڈ میں پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے (۸۶)۔ ہملٹن کے مطابق شہر ٹھٹھ، سندھ میں چار سو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے (۸۷)۔ میکس مولر کے مطابق بنگال ہی میں ۸۰۰۰۰ مدرسے تھے (۸۸)۔ اس لحاظ سے چار سو آدمیوں کے لیے ایک مدرسے کا اوسط نکلتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ خاندان ایسے اسکول کا خرچ بھی برداشت کرتے تھے۔ جس میں ان کے اور ان کے ہمسایوں کے لیے مفت تعلیم کا انتظام ہوتا۔ مروجہ چندوں کی روایت تو بہت بعد کی ہے، دور عروج میں ان جامعات کے

مدرسین کی کفالت عموماً ریاست ہی کرتی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

''ان مدرسین کے ضروریات زندگی کی کفالت عموماً حکومت ہی کرتی تھی۔ حکومت کے بعد عام مسلمان، مدرسین کی امداد مختلف صورتوں سے کرتے تھے۔ حکومت یا پبلک کی جانب سے ان کی معاشی سہولتیں خواہ بہ شکل تنخواہ و وظائف یا بہ شکل جاگیر بہم پہنچادی جاتی تھیں''۔(۸۹)

یہی وہ نصاب تعلیم تھا جس نے اس دور کے تقاضوں کے مطابق معاشیات، سیاسیات اور عدالتی امور کے ماہرین پیدا کیے۔ چنانچہ مجدد الف ثانی اور اورنگ زیب عالم گیر دونوں اسی نظام تعلیم کے پروردہ تھے۔ فتاویٰ عالم گیری کے مدون اور تاج محل کے انجینئر بھی ان ہی جامعات کے پروردہ تھے۔ اگر چہ نصاب تعلیم کا دورانیہ آٹھ سال تھا جس کے مطابق محض سترہ سال میں علوم وفنون کی تحصیل ہوجاتی تھی اور اس نوجوانی میں ہی وہ ریاست کی ترقی کے حوالے سے مختلف شعبوں سے منسلک ہوجاتے تھے لیکن اس کے باوجود مزید علم اور تخصص کا شوق لوگوں کو اپنی طرف مائل رکھتا(۹۰)۔ چنانچہ ان علوم وفنون کی تکمیل کے بعد طلبہ ان علوم میں سے کسی ایک میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے لیے اس علم کے ماہرین تک رسائی حاصل کرتے۔ ان علوم و فنون میں زبان سے نفرت کی بجائے اس میں مہارت حاصل کرنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے عبرانی زبان کے کسی فاضل سے (جو اتفاق سے دہلی آئے ہوئے تھے) عبرانی زبان میں تورات پڑھی تھی(۹۱)۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے حج کے سفر سے واپسی پر جہاز کے انگریز کپتان کو ترجمان کے ذریعہ اپنے علم سے مبہوت کردیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے عزم فرمایا تھا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا(۹۲)۔ کیونکہ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ اگر ترجمان کے ذریعہ اس پر اتنا اثر ہوا ہے تو اصل زبان کی تاثیر تو اس سے اور بھی زیادہ ہوگی۔ حصول زبان کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے آخری خطبے میں (جو جامعہ ملیہ میں دیا گیا تھا) یوں فرمایا تھا:

''آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری

قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا''۔(۹۳)

انگریز سامراج کی آمد سے قبل برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم کی سطح کا معیار سو فیصد تھا(۹۴)۔جبکہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو ملا کر یہ شرح ۸۴% تھی۔یہ علمی روایت ۱۸۳۹ء تک قائم رہی۔طلبہ کی علمی سطح کے بارے میں مشہور انگریز مستشرق ولیم میور نے ان سے تبادلۂ خیال کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

''میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی سطح آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبہ سے کسی طور بھی کم نہیں''۔(۹۵)

مسلم حکمرانوں کے دور میں سرکاری اور عوامی زبان فارسی تھی جبکہ علماء کی زبان فارسی اور عربی دونوں تھیں۔جامعات میں دیگر علوم وفنون کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم بھی دی جاتی تھی۔کتب بینی اور کتب نویسی کے رجحانات اور روایات کو فروغ حاصل تھا۔تعلیم کے نصاب اور حصول میں علاقائی روایات اور مذہبی اقدار کا مکمل خیال رکھا جاتا تھا۔

تعلیم کے روایتی اداروں کے ساتھ ساتھ خانقاہوں کا تربیتی ادارہ بھی موجود تھا،جس کے ذریعہ انسان دوستی،روحانی ترقی اور اجتماعی اصلاح کے اثرات پیدا کیے جاتے۔صوفیہ نے ایک طرف تو عوام الناس میں اسلامی تعلیمات کا حقیقی شعور بیدار کیا جبکہ دوسری طرف حکمرانوں کے لیے ایک مضبوط اور طاقت ور اپوزیشن کا کردار ادا کیا۔اس دور کے صوفیہ شریعت،طریقت اور سیاست کے جامع ہوتے تھے۔اس مکمل نظام تعلیم میں دین اور دنیا کی تفریق نہ تھی بلکہ اس کا مقصد فہم وشعور اور آداب و اخلاق کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔یہی وجہ ہے دور دراز ممالک سے طالبان علم اس خطے کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ:

''برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا بارہ سو سالہ دور حکومت علمی، تعلیمی اور فکری اعتبار سے ایک نمایاں اور قابل ذکر دور ہے۔یہاں کے اہل علم نے تعلیم کے میدان میں جو روایات قائم کیں،ان سے کسب فیض کے لیے وسط ایشیا اور موجودہ رشین فیڈریشن کے انتہائی آخری کناروں سے حتی کہ مشرقی یورپ کے علاقے بوسنیا سے،مصر سے اور عرب دنیا کے مختلف گوشوں سے اہل علم

اور طلبا کسب فیض کے لیے آیا کرتے تھے''۔(۹۶)

انگریز سامراج نے ہر لحاظ سے خوش حال اس خطے کو انتشار وافتراق کا گڑھ بنا دیا۔ مسلم حکمرانوں کے سیاسی غلبے کو بتدریج ختم کر کے Divide and Rule کی پالیسی اپنائی۔ چنانچہ انگریز پالیسی ساز نے لکھا ہے کہ:

''لڑاؤ اور حکومت کرو Divide and Rule رومن کا مقولہ ہماری ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہیے۔ عام اس سے کہ وہ سیاست یا تمدن یا فوج کشی کے متعلق ہو''۔(۹۷)

مسلمان چونکہ ایک غالب اور فاتح قوم کی حیثیت سے اس خطے کو سیاسی وحدت دینے والے تھے۔ اس لیے دور زوال میں ان سے امتیازی سلوک برتا گیا۔ ان کو ریاستی امور سے بے دخل اور ملازمتوں سے محروم کیا گیا۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے کہ:

''مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں''۔(۹۸)

جان مینارڈ لکھتا ہے:

''ہندو اور مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی''۔(۹۹)

فسادات کرانے کے لیے موقع ومفاد پرست عناصر کو مالی امداد دی گئی۔ متشددانہ پالیسیوں کے ذریعہ رعایا پر رعب قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا گیا (۱۰۰)۔ نوجوانوں کے جسموں پر سور کی چربی مل کر انہیں دہکتے انگاروں پر لٹا کر تنکوں کی طرح بھونا گیا۔ توپوں سے اڑا دیا اور ان کے دماغوں کو گرم سلاخوں سے داغا گیا۔ گولیوں سے چھلنی کیا گیا اور شہزادوں کی نعشوں کو گلی کوچوں میں گھسیٹا گیا (۱۰۱)۔ بعض سامراج نوازوں کی رائے میں انگریزوں نے اس خطے کو ترقی دی اور انہوں نے ملک میں ریل گاڑی کی پٹریوں کا جال بچھا دیا۔ حالانکہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انگریز سامراج نے یہ نام نہاد ترقیاتی عمل ان آزادی پسند عناصر کی انقلابی سرگرمیوں کو دبانے کے لیے اختیار کیا تھا جنھوں نے ان کے اقتدار کو چیلنج کیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت

یہ ہے کہ ابتدا میں یہ گاڑیاں مال بردار ہوا کرتی تھیں جن پر بھاری توپ خانہ اور افواج کو برق رفتاری سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا تھا۔اس کے بہت بعد ان گاڑیوں کو سفری طور پر استعمال کیا گیا اور اس میں بھی لوور، اکانومی اور ہائی کلاسس کی طبقاتی تقسیم کی گئی۔

سب سے بڑھ کر مسلم حکمرانوں نے اس خطے کو رواداری، اتحاد و یکجہتی اور باہمی اتفاق کی جس دولت سے نوازا تھا اسے برباد کر دیا گیا۔ظہیر الدین بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ:

> ''شیعہ و سنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا۔جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں، اسی طرح مختلف مذاہب کی رعایا کو ملا جلا کر رکھو اور ان میں اتحاد عمل پیدا کرو''۔(۱۰۲)

اس وصیت کو ہمایوں اور بعد کے تمام حکمرانوں نے اپنے سامنے رکھا اور مذہبی رواداری کے کلچر کو فروغ دیا۔لیکن انگریز سامراج نے اس خطے میں نفاق کے بیج بوئے اور ان میں باہمی پھوٹ ڈال کر اپنی حکومت کو استحکام بخشا۔مولانا مدنی لکھتے ہیں کہ:

> ''انگریز سامراج نے کبھی ایک جماعت پر دست شفقت پھیرا اور کبھی دوسری پر اور اس ذریعہ سے مختلف ملتوں میں رقابت پیدا کر کے حسد، عناد، مذہبی کشت و خون کی صورتیں پیدا کیں''۔(۱۰۳)

یہ بات درست ہے کہ برصغیر کی آزادی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی برابر کے شریک تھے اور ۱۸۰۷ء کی جنگ آزادی تک یہ سلسلہ چلتا رہا تھا مگر انگریز نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے انہیں زیادہ عتاب کا شکار بنایا۔ چنانچہ انگریز سامراج نے مسلمانوں کے مقابل ہندوؤں کو زیادہ مراعات دے کر باہمی انتشار و افتراق کا نیا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ امبکا چرن لکھتا ہے کہ:

> ''اول اول اپنی عمل داری کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو

اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب ہوا"۔(۱۰۴)

سیاسی آزادی کو سیاسی غلامی میں تبدیل کر دیا گیا۔ تعلیمی نظام اس طرح کا وضع کیا گیا کہ جس سے سیاسی شعور کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں۔اس کے برعکس خودساختہ، انفرادی مسائل میں لوگوں کو اس قدر الجھایا گیا کہ اجتماعی سوچ دم توڑتی چلی گئی۔ ہندوستان کو ہمیشہ غلام رکھنے کی ہوس اور اس کو ہمیشہ لوٹتے رہنے کی خواہش کی وجہ سے انگریز ہمیشہ یہی چاہتے رہے کہ ہندوستانیوں کی ذہانت بالکل برباد کر دی جائے، ان میں علمی بے داری پیدا نہ ہونے دی جائے (۱۰۵)۔ لارڈ میکالے کے نظریہ تعلیم کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ یہ لوگ رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوں مگر تہذیب وتمدن اور فکر وشعور کے لحاظ سے انگلستانی ہوں (۱۰۶)۔ چنانچہ اس نظام تعلیم کے تحت ہندوستانی عوام کو کلرکی اور ادنیٰ درجے کی ملازمت پر مصروف رکھا۔ مسلم حکمرانوں کے دور میں تعلیم کا مقصد فکری بالیدگی اور اعلیٰ سطح کے فکر وشعور کا حصول ہوتا تھا۔ تعلیم حصول روزگار کے لیے حاصل نہیں کی جاتی تھی، لیکن انگریز نے تعلیم کو حصول روزگار کا ذریعہ بنا کر تعلیمی ڈھانچے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اس کے لیے چار بڑے اقدامات کیے گئے:

(الف) سب سے پہلے فارسی اور عربی زبان کو ختم کیا اور سرکاری زبان انگریزی قرار دے دی گئی جس کے نتیجے میں وہ تمام لوگ جو ۱۸۰۷ء تک تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے وہ سب کے سب سرکاری اور انتظامی مناصب کے لحاظ سے اور ان کے تقاضوں کے مطابق غیر تعلیم یافتہ ہوگئے۔(۱۰۷)

(ب) دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ سیاسی اقتصادی اور عسکری علوم وفنون کو نصاب سے نکال کر اس کو محض نظری علوم تک محدود کر دیا گیا۔

(ج) فضول اور زائد از حاجات کتابیں اور فنون کو لازمی قرار دیا گیا جس سے علمی ترقی بالکل رک گئی۔(۱۰۸)

(د) سائنسی تعلیم کو عملی تعلیم کے طور پر پڑھانے کی بجائے محض نظری تعلیم تک محدود کر دیا گیا اور جو سائنسی علوم پڑھائے گئے اس سے مسلمانوں کے مذہبی و دینی عقائد متصادم ہوتے تھے۔

اکبرالہ آبادی انگریز سامراج کے تعلیمی نظریات پر حقیقت پسندانہ تنقید کی ہے۔ اکبر یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی نظام تعلیم محض چند نئے علوم وفنون کی تدریس کا نام نہیں بلکہ ایک نئی تہذیب کا علم بردار ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

علوم ان کے زبان ان کی پریس ان کے لغات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزاء پر ہیں ہاتھ ان کے

تعلیم کو بطور روزگار متعارف کرانے کے متعلق ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں کہ

''انگریزی دور سے قبل تعلیم اور روزگار یا تعلیم اور ذریعہ آمدنی کا وہ تعلق موجود نہیں تھا جو گزشتہ دو صدیوں کے دوران قائم کردیا گیا ہے۔ چونکہ تعلیم سے مراد اب صرف انگریزی تعلیم ہے اور اس کی واحد غرض حصول روزگار ہے، اس لیے تعلیم اور روزگار لازم وملزوم بن گئے ہیں''۔(۱۰۹)

وہ خطہ جس کی تعلیم کی شرح سو فیصد تھی، ۱۷۶۵ء سے ۱۹۳۱ء تک تقریباً پونے دو سو برس میں یہ دس فیصد تک رہ گئی۔ تعلیم کی مد میں رقم خرچ کرنے کو پیسوں کا ضیاع سمجھا گیا۔ اس کے برعکس فوجی اخراجات پر بے بہا پیسہ خرچ کیا گیا۔ ڈی ہملٹن نے کہا کہ:

''اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا جس طرح رومن نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظان صحت کا سامان ہوگا اور نہ ہی دولت ہوگی''۔(۱۱۰)

وہ علوم وفنون جو اس خطے کی علمی، مادی اور روحانی ضروریات کو پورا کررہے تھے، ان کو بتدریج ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس خطے کے دو عظیم علمی اداروں دارالعلوم اور علی گڑھ کالج میں باہمی چپقلش اور عناد کی فضا قائم کی گئی حالانکہ دونوں اداروں کے بانیان کے باہمی تعلقات بہت اچھے تھے۔ بہرحال دینی اور دنیاوی علوم کی ثنویت اسی دور کی یادگار ہے۔ ایک نے دوسرے کو نیچری اور لادین کہا جبکہ دوسرے نے قدامت پسندی کے طعنے دیے۔ اس طرح ان اداروں میں نظریاتی طور پر اس قدر وسیع خلیج پیدا کی گئی کہ آج تک ہم اس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس خلیج کو بعدازاں مولانا محمود حسنؒ نے جامعہ ملیہ کے مقام پر دور کرنے کی کوشش کی اور اسی کوشش

کے نتیجے میں ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے مستقبل کے حوالے سے ایک جامع فلسفہ تشکیل دیا۔ آزادی پسند حلقوں کو انگریز سامراج سے اختلافات صرف اس بات کا تھا کہ جن علوم وفنون کی بنیاد پر انگریز نے اپنی قوم کو صنعتی اور معاشی ترقی پر گامزن کیا برصغیر میں ان علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے حوالے سے دوہرا رویہ اپنایا اور اس خطہ میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جس سے غلامی کی سوچ پروان چڑھے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے لکھا کہ:

> ''اہل مغرب نے اپنے وہ علوم وفنون جن پر ان کی ترقی کا دارو مدار تھا، یعنی سائنس کے اعلیٰ مضامین اور ٹیکنالوجی کے اونچے فنون، اپنے تک ہی محدود رکھے اور اہل مشرق کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے دی''۔(۱۱۱)

گزشتہ تفصیلات سے یہ شبہات پیدا ہوسکتے ہیں کہ کیا برعظیم کی اس تباہی کا ذمہ دار صرف انگریز تھا؟ کیا اس خطے کے لوگ اس کی سامراجی مقاصد کے حصول اور نوآبادیاتی نظام میں بطور اس کے آلہ کار استعمال نہیں ہوئے؟ کیا تابناک ماضی رکھنے والے مسلم حکمرانوں کے جانشین اپنی نادانش مندانہ پالیسیوں کے باعث اس خطے میں انگریز سامراج کے اقتدار اور اس اقتدار کے نتیجے میں ظلم وستم کی وجہ نہیں بنے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر عروج کا ایک زوال ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم بھی اگر انسانیت کے بنیادی اور فطری تقاضوں سے ہٹتی ہے تو تاریخ کا ازلی قانون یہ رہا ہے کہ اس کی بالادستی بھی قائم نہیں رہتی۔ جو قوم سقوط بغداد میں خلافت عباسیہ کی تباہی کا باعث بنی وہی برصغیر میں اشاعت اسلام، امن وامان، عدل وانصاف اور وحدت انسانی کی فضا قائم کرنے کا باعث بھی بنی۔ چنانچہ قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں میں بہت سی چیزیں مشترک نظر آتی ہیں۔ تاریخ کے ان فطری تقاضوں سے مغلوں کی بادشاہت بھی نہ بچ سکی۔

یقیناً برعظیم کی تباہی میں جتنا قصور انگریز سامراج کا ہے اتنا ہی اپنوں کی ریشہ دوانیوں، سہل پسندیوں اور عیاشیوں کا بھی ہے۔ مغل حکمرانوں کے ناخلف جانشینوں اور ان کے حاشیہ برداروں نے مرکزیت کو کمزور کرکے طوائف الملوکی کو پنپنے کا موقع دیا۔ حکمرانوں کے غیر سیاسی رویوں نے ان کے گرد سازشوں کے جال کس دیے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:

''بادشاہ ہنگامہ ہائے ناؤنوش میں مدہوش اور عیش وعشرت میں غرق تھے۔ان کے چاروں طرف امراء کی سازشوں کا ہولناک جال بچھا ہوا تھا۔ صوبوں میں خودمختاریاں اورنوابیاں قائم ہورہی تھیں،سارا ملک سیاسی نبرد آزمائی اورکش مکش کا بازیچہ بن گیا تھا''۔(۱۱۲)

ان کمزور حکمرانوں کی کمزور پالیسیوں کی وجہ سے ملکی سطح پر مرہٹے،سکھ، جاٹ ، روہیلے سب میں ملک گیری کی ہوس پیدا ہوگئی تھی ۔ملک کے گوشے گوشے میں باغیانہ قوتیں کام کررہی تھیں ۔لوٹ ماراورقتل وغارت گری کا بازارگرم تھا۔ملک کے داخلی انتشار سے فائدہ اٹھا کر بیرونی طالع آزماؤں نے بھی دانت تیز کر لیے۔افغانستان کا ایک حصہ اٹھارہویں صدی سے پیشتر ایران کے ماتحت تھا جبکہ دوسرا حصہ ہندوستان کے ماتحت تھا (۱۱۳)۔۱۷۳۰ء میں ایران کے فرماں روا نادرشاہ نے افغانوں کوایران سے بالکل بے دخل کردیا (۱۱۴)۔اس نے ۱۷۳۶ء میں ایران سے خاندان صفویہ کا مکمل خاتمہ کردیا۔اس کے بعدوہ افغانستان پرحملہ آورہوا جو مغل سلطنت کے ماتحت تھااور ۱۷۳۸ء میں اس پربھی قابض ہوگیا۔مغل شہنشاہ محمد شاہ سے جب مددطلب کی گئی اوراسے خطرے سے آگاہ کیا گیا تو اس نے ''ہنوز دلی دوراست'' کا جواب دے کرانتہائی غیرذمہ داری کا مظاہرہ کیا (۱۱۵)۔چنانچہ ۱۷۳۹ء میں نادرشاہ نے دہلی کے قریب کرنال میں مغل شہنشاہ کی بہت بڑی فوج کوشکست دی ، دہلی پر قبضہ کیا اور وہاں خوف ناک قتل عام کروایا (۱۱۶)۔ سلطنت مغلیہ کا ایک فرد نظام الملک تھا جس نے دکن میں مملکت حیدرآباد کی بنیادرکھی تھی ۔نظام جوکہ انتہائی زیرک اورمدبرانسان تھا اس نے مغل شہنشاہ اورنادرشاہ میں معاہدہ کروانے کی کوشش کی تاکہ ریاست خون خرابے سے بچ سکے مگر نادرشاہ کی ہوس نے معاہدہ کی خلاف ورزی پرمجبور کیا اوراس نے نظام الملک کواپنی حراست میں رکھا۔

''وہ دہلی میں دومہینے رہا۔بے شمار مال ودولت لے کر نادرشاہ ایران چلا گیا۔وہ اپنے پیچھے خالی خزانہ اورتباہ وبرباد صنعت وحرفت چھوڑ گیا''۔(۱۱۷)

نادرشاہ کے حملے نے دہلی کواجاڑ کررکھ دیا۔جب نادرشاہ ہندوستان سے چلا گیا تو مرکز کی کمزوری کی وجہ سے سلطنت دہلی کے تین زرخیز صوبے بنگال ، بہار، اڑیسہ علاحدہ ہوگئے ۔یاد

رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب برطانوی اور فرانسیسی اس خطے کی حکمرانی کی جنگ لڑ رہے تھے۔اس موقع پر اگر مغل حکمران اس ابھرتی طاقت کو ختم کر دیتے تو یہ فتنہ یہیں ختم ہو جاتا۔تاریخی اعتبار سے اس بات کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا کہ مغلیہ سلطنت کا زوال کب شروع ہوا لیکن یہ بات حتمی ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر کے آخری دور میں اس کا آغاز ہو گیا تھا۔مغل حکمرانوں کے اندرونی اختلافات اور سازشوں نے مرکز کی حیثیت کو ختم کر دیا۔فوج میں آرام طلبی،فرض ناشناسی اور خودغرضی جیسی قبیح خصلتیں پیدا ہو چکی تھیں۔حکمران اقتصادی بدحالی سے بے خبر تھے۔عوام پر سخت ٹیکس لگا کر انہیں مزید بدحال کیا جا رہا تھا۔چنانچہ عوام انگریز سامراج اور نااہل حکمرانوں کے بیچ پس رہے تھے۔درحقیقت پورا نظام کھوکھلا ہو چکا تھا۔دوسری طرف بنگال میں انگریزوں نے سراج الدولہ کو جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء میں شکست سے دوچار کیا۔جنگ پلاسی نے انگریز سامراج کو جواب تک اس ملک کو داخلی طور پر کمزور کر رہا تھا، یہ موقع فراہم کیا کہ اب براہ راست دخل اندازی کرے۔ٹھیک اس جنگ کے سو سال بعد ۱۸۵۷ء میں پورے ملک پر انگریز نے مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔جنگ پلاسی کی شکست ہی نے یورپ کو صنعتی انقلاب پر ڈالا۔اس حوالے سے قاضی جاوید لکھتے ہیں کہ:

> ''جنگ پلاسی کے بعد بنگال کا مال غنیمت لندن میں آنا شروع ہوا اور اس کا نتیجہ بہت جلد رونما ہوا۔اتنا بڑا صنعتی انقلاب جس کے اثرات آج دنیا کے گوشے گوشے میں نمایاں ہیں شاید وجود ہی میں نہ آتا اگر پلاسی کی لڑائی نہ ہوتی۔کیونکہ ہندوستان ہی کا خزانہ اس کا محرک ومدد ومعاون ثابت ہوا''۔(۱۱۸)

مصادر و مراجع

(۱) قاسمی،شمس القمر،روداد برصغیر ص ۱۳،رحیمیہ مطبوعات،لاہور ۲۰۱۰ء۔(۲) ایضاً ص ۱۰۔(۳) سندھی، عبیداللہ،مولانا،شعور و آگہی،ص ۱۳۷-۱۳۶،طیب پبلشرز،لاہور،۲۰۰۱ء۔(۴) ایضاً،ص ۱۴۵۔(۵) منگلوری،طفیل احمد،سید،مسلمانوں کا روشن مستقبل،ص ۶۲،حماد الکتبی،لاہور،۱۹۴۵ء۔(۶) مولانا حسین احمد

مدنی کے مطابق انگریز تاجروں کی آمد ۱۵۹۹ء میں ہوئی، ملاحظہ ہو ''نقش حیات'' ص ۱۹۸۔ (۷) غلام کبریا، آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ، ص ۱۴۵، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۲ء۔ (۸) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۵۴، طیب پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۱ء۔ (۹) شاہ جہاں پوری، ابوسلمان، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری، ج ۱، ص ۱۰، مجلس یادگار شیخ الاسلام، کراچی، ۲۰۰۲ء۔ (۱۰) منگلوری، طفیل احمد، سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۶۲۔ (۱۱) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۵۷۔ (۱۲) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۱۵۷، دارالاشاعت کراچی۔ (۱۳) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر ص ۱۱۔ (۱۴) صباح الدین عبدالرحمٰن، سید، اسلام میں مذہبی رواداری، ص ۲۸۰، دارالشعور، لاہور، ۲۰۱۰ء۔ (۱۵) صباح الدین عبدالرحمٰن، سید، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص ۲۰۴، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔ (۱۶) منگلوری، طفیل احمد، سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۵۵۔ (۱۷) ایضاً، ص ۵۰۔ (۱۸) ماخوذ از مضامین بابوسندر لال مصنف ''بھارت میں انگریزی راج'' مندرجہ ''استقلال''، دیو بند، مورخہ ۴/ مارچ ۱۹۳۶ء۔ (۱۹) محمد میاں، سید، علمائے ہند کا شاندار ماضی، ج ۱، ص ۴۳۶، مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۹۲ء۔ (۲۰) منگلوری، طفیل احمد، سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۵۴۔ (۲۱) انڈین ریکارڈس، سیریز بنگال، ۵۷-۱۸۵۶ء، ص ۴۷۔ (۲۲) اس موضوع پر یہ کتاب قابل ملاحظہ ہے ''تاریخ سلطنت خداداد میسور''، مصنف محمود خان، مسلم بک ڈپو، بنگلور۔ (۲۳) منگلوری، طفیل احمد، سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۵۳۔ (۲۴) ایضاً، ص ۵۹۔ (۲۵) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر، ص ۱۱۱۔ (۲۶) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۱۶۲-۱۶۱۔ (۲۷) مجلّہ عزم (سیریز نمبر ۱۹۷)، ص ۳، جون ۲۰۰۲ء۔ (۲۸) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۲۹۔ (۲۹) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۴۶۔ (۳۰) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۵۲۔ (۳۱) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر، ص ۶۴۔ (۳۲) رسالہ منظوم کسان، ص ۱۳۔ (۳۳) ایضاً۔ (۳۴) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۴۶۔ (۳۵) ایضاً، ص ۲۴۸۔ (۳۶) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، ہزار سال پہلے، ص ۹۴، بیت العلم، کراچی، ۲۰۰۴ء۔ (۳۷) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۵۳۔ (۳۸) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر، ص ۶۶۔ (۳۹) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۵۴-۲۵۳۔ (۴۰) ایضاً، ص ۲۷۷-۲۷۶۔ (۴۱) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۴۵۔ (۴۲) ایضاً، ص ۴۶۔

(۴۳) ایضاً، ص ۴۵ ۔ (۴۴) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۶۹ ۔ (۴۵) ایضاً، ص ۲۶۶۔ (۴۶) ایضاً، ص ۲۴۷۔ (۴۷) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۴۵۔ (۴۸) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۱۹۷-۱۹۶۔ (۴۹) ایضاً، ص ۱۹۷۔ (۵۰) ایضاً۔ (۵۱) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، ہزار سال پہلے، ص ۲۱۳۔ (۵۲) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر ص ۵۵۔ (۵۳) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، ہزار سال پہلے، ص ۱۷۳۔ (۵۴) ایضاً، ص ۱۷۶۔ (۵۵) ایضاً۔ (۵۶) غلام کبریا، آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ، ص ۴۲۔ (۵۷) کارل مارکس، داس کیپٹل (مترجم: سید محمد تقی)، ج ۱، ص ۹۱، دارالشعور، لاہور، ۲۰۰۴ء۔ (۵۸) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر ص ۵۷ (۵۹) رسالہ منظوم کسان، ص ۱۳۔ (۶۰) گیلانی، مناظر احسن، مولانا، ہزار سال پہلے، ص ۱۱۶۔ (۶۱) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۰۴۔ (۶۲) ایضاً، ص ۲۰۶۔ (۶۳) ایضاً، ص ۲۲۰۔ (۶۴) ایضاً، ص ۲۲۶۔ (۶۵) اخبار ''سچ''، لکھنؤ، ۱۳/ جولائی ۱۹۲۸ء۔ (۶۶) اخبار ''مدینہ''، بجنور، ۲۵/ مارچ ۱۹۳۰ء۔ (۶۷) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۳۷-۲۳۶۔ (۶۸) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر ص ۷۲۔ (۶۹) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۹۶۔ (۷۰) انگلستان کی حکومت نے ۱۷۰۰ء میں ایک قانون کے تحت انگلستان میں ہندوستان کے کپڑے کی درآمد کو ممنوع کر دیا تھا۔ (۷۱) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۴۵۔ (۷۲) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۹۶۔ (۷۳) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۲۸۸۔ (۷۴) ایضاً، ص ۲۸۹۔ (۷۵) ایضاً، ص ۲۹۲۔ (۷۶) ایضاً، ص ۲۹۶ ۔ (۷۷) ایضاً، ص ۲۲۶ ۔ (۷۸) ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۳۳۷۔ (۷۹) مجلّہ مجلّہ عزم (سیریز نمبر ۲۱۴)، ص ۱۵، اگست-ستمبر ۲۰۰۴ء، ملتان۔ (۸۰) منگلوری، طفیل احمد، سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۴۹ ۔ (۸۱) ایضاً، ص ۴۴ ۔ (۸۲) ایضاً، ص ۴۶ ۔ (۸۳) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، ص ۴۷، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ، ۲۰۰۹ء۔ (۸۴) ایضاً۔ (۸۵) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۱۸۲۔ (۸۶) ندوی، ریاست علی، سید، عہد اسلامی کا ہندوستان، ص ۲۴۲، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۱ء۔ (۸۷) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر ص ۱۰۳۔ (۸۸) ایضاً، ص ۱۰۴۔ (۸۹) منگلوری، طفیل احمد، سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۶۲۔ (۹۰) گیلانی، مناظر احسن، سید، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ج ۱، ص ۳۴۳-۳۴۲، مکتبہ رحمانیہ، لاہور۔ (۹۱) علم

کا ذوق شوق تمام عمر جاری رہتا تھا۔ چنانچہ شیخ احمدی فیاض نے مرض موت کے وقت قرآن حفظ کیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے اخیر عمر میں صرف چار ماہ کے عرصے میں قرآن حفظ کیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سفر حج کے دوران قرآن حفظ کیا۔ مولانا مدنی نے مالٹا کی قید کے دوران قرآن حفظ کیا۔ (۹۲) دہلوی، شاہ عبدالعزیز، ملفوظات عزیزیہ، ص ۲۷، مطبع مجتبائی، دہلی۔ (۹۳) گیلانی، مناظر احسن، سید، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج ۲، ص ۴۰۔ (۹۴) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۶۷۷۔ (۹۵) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، ص ۵۶۔ (۹۶) ایضاً، ص ۵۹۔ (۹۷) ایضاً، ص ۵۵۔ (۹۸) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر، ص ۴۷۔ (۹۹) ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۲۳۷۔ (۱۰۰) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۳۰۹۔ (۱۰۱) قاسمی، شمس القمر، روداد برصغیر، ص ۵۱۔ (۱۰۲) ایضاً، ۴۹۔ (۱۰۳) روزنامہ خلافت (دہلی)، ج ۵، شمارہ نمبر ۱۶۰، ۱۸/اگست ۱۹۲۶ء۔ (۱۰۴) مدنی، سید، حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۳۱۹۔ (۱۰۵) ایضاً۔ (۱۰۶) ایضاً، ص ۱۸۴۔ (۱۰۷) منگلوری، طفیل احمد، سید، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۳۱۔ (۱۰۸) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، ص ۱۰۳۔ (۱۰۹) مدنی حسین احمد، نقش حیات، ج ۱، ص ۱۸۶۔ (۱۱۰) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، ص ۱۰۳۔ (۱۱۱) روزنامہ ملت دہلی، ۲۶/جولائی ۱۹۳۲ء۔ (۱۱۲) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، ص ۹۱۔ (۱۱۳) نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۸، ادارہ اسلامیات، ۱۹۷۸ء۔ (۱۱۴) قاسم محمود، سید، اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام، ص ۶۹، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، ۲۰۱۲ء۔ (۱۱۵) ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۵، ص ۲۶، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ (۱۱۶) نادرشاہ کے حملے سے قبل دہلی کی مرکزی حکومت کی طرف سے کابل کے گورنر کو سیاسی استحکام کے لیے مالی امداد دی جاتی تھی۔ اس امداد کے بند ہوجانے کے بعد افغانستان کی فوجی چھاؤنیاں قائم نہ رہ سکیں۔ ان حالات نے نادرشاہ کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنا آسان کردیا۔ (۱۱۷) ندوی، ابوالحسن علی، تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۵، ص ۲۷۔ (۱۱۸) باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۶۰۔ (۱۱۹) قاضی جاوید، افکار شاہ ولی اللہ، ص ۱۰۳، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۶ء۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اور حیدر آباد

سید شکیل احمد انورؔ

آمد حیدر آباد: علامہ شبلی نعمانی پہلی بار حیدر آباد ۱۸۹۱ء میں سر سید احمد خاں کے اس وفد کے ساتھ آئے تھے جو اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ کی مالی امداد کے حصول کے لیے آیا تھا۔اس وفد نے نواب محبوب علی خاں نظام ششم والی ریاست سے ملاقات کی جس پر انہوں نے علی گڑھ کالج کی امداد کو دو گنا یعنی دو ہزار روپے سالانہ کرنے کا حکم دیا۔اس دورہ حیدر آباد کے موقع پر ایک شاندار جلسہ نواب وقار الامراء کی زیر صدارت بشیر باغ میں منعقد کیا گیا تھا جس میں سر سید اور دیگر ارکان وفد کی تقریروں کے علاوہ مولانا حالی اور علامہ شبلی نے اپنے اردو اور فارسی قصائد پیش کیے تھے۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی دوسری بار ۱۸۹۶ء میں حیدر آباد آئے۔یہ نواب وقار الامراء کی وزارت کا زمانہ تھا۔مولوی سید حسین بلگرامی کو جن سے علامہ شبلی کے خاص روابط تھے نواب صاحب کے یہاں خصوصی رسوخ حاصل تھا۔انہوں نے نواب صاحب ممدوح سے علامہ کی علمی خدمات کا ذکر کیا اور گزارش کی کہ ان کے تصنیفی کام کو آگے بڑھانے اور علی گڑھ کالج میں درس و تدریس کی خدمت سے فارغ کرنے کے لیے ریاست سرکار عالی سے ان کے نام وظیفہ تصنیفی جاری فرمایا جائے۔چنانچہ سو روپے کلدار ۱۳ر ستمبر ۱۸۹۶ء سے علامہ شبلی کے نام منظور ہوئے۔(۲)

سر رشتہ ترجمہ علوم وفنون کی نظامت: علامہ شبلی نعمانی ۱۸۹۶ء میں چار پانچ ہفتے حیدر آباد میں قیام کے بعد واپس ہو گئے۔تیسری بار وہ فروری ۱۹۰۱ء میں حیدر آباد آئے۔یہ آمد بہتر ملازمت کی تلاش میں تھی۔نواب مدار المہام نے محکمہ امور مذہبی میں نظامت کی ذمہ داری سونپنا چاہی لیکن یہ انہیں منظور نہ ہوا تو سر رشتہ علوم وفنون کی نظامت پر ان کا تقرر عمل میں آیا علوم وفنون کی کتابوں

آر کا ئیوسٹ ریٹائرڈ، 6-3-1498، ینٖ جی اوز کالونی، و نستھلی پورم، حیدر آباد ۵۰۰۰۷۰، آندھرا پردیش۔

کے ترجمے اور اشاعت کی غرض سے یہ ادارہ نواب وقارالامراء مدارالمہام نے ۱۸۹۵ء میں قائم فرمایا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس ذمہ داری کو ساڑھے تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ ادا کیا اس دوران موصوف کی تنخواہ ماہانہ دوسو روپے سے بڑھ کر پانچ سو روپے تک رہی۔ البتہ سابقہ وظیفہ تصنیفی مسدود ہو گیا۔ اس عرصے میں انہوں نے پانچ کتابیں تصنیف کیں جن کے نام ہیں: الغزالی، علم الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر اور الکلام۔ فروری ۱۹۰۵ء تک اس خدمت پر مامور رہنے کے بعد یہاں کی آب و ہوا موافق نہ ہونے پر انہوں نے مستعفی ہو جانے اور سابقہ وظیفہ تصنیفی کے دوبارہ اجراء کی درخواست حکومت سرکار عالی میں پیش کر دی۔ مہاراجہ کشن پرشاد اس وقت پیشکار تھے انہوں نے عرض داشت مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۵ء نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم کی خدمت میں پیش کی جنہوں نے اپنے فرمان مورخہ ۲۱ر ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ استعفیٰ کی منظوری وظیفہ تصنیفی اور سابقہ وظیفہ کے اجراء کا حکم صادر فرمایا۔ (۳)

۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو نواب یوسف علی خاں سالار جنگ سوم نے علامہ شبلی نعمانی کی درخواست پر وظیفہ تصنیفی میں اضافے کی عرض داشت نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ ہفتم کی خدمت میں پیش کی جس پر فرمان جاری ہوا جس میں اضافہ شدہ وظیفہ کی رقم تین سو روپے کلدار ہوگئی۔ مگر علامہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء اس جہان فانی سے رخصت ہوئے بعد میں جناب حامد نعمانی فرزند علامہ شبلی کی درخواست پر یہ وظیفہ دارالمصنّفین کے نام از روئے احکام سرکار عالی منتقل کر دیا گیا۔ (۴)

اسکیم قیام مدارس علوم مشرقیہ: حیدرآباد کی قدیم درس گاہ دارالعلوم جو بہ عہد نواب میر تراب علی خان حیدرآباد سالار جنگ اول ۱۸۵۳ء میں قائم کی گئی تھی اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے تھا مگر جب یہ تعلق منقطع ہو گیا تو اس کے عربی و فارسی کے نصاب تعلیم کو مرتب کرنے کے لیے محکمہ تعلیم سرکار عالی نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ایک رکن علامہ شبلی نعمانی بھی تھے چنانچہ علامہ نے یہ نصاب مرتب کیا اور ایک تفصیلی یادداشت بنام "اسکیم قیام مدارس علوم مشرقیہ" پیش کی تھی جس کا اقتباس محکمہ مذکورہ کی فائل سے پیش کیا جاتا ہے۔

"۱۳۱۸ء فصلی مطابق ۱۹۰۸ء میں بہ حکم سرکار ایک کمیٹی اس غرض سے قائم کی گئی کہ نصاب تعلیم دارالعلوم میں اصلاح کی جائے۔ اس کمیٹی میں شمس العلماء مولانا شبلی کو بھی دعوت دی

گئی جن کی رائے پر زیادہ تر نصاب تعلیم کی اصلاح کا دار و مدار تھا۔ کمیٹی نے اس کام کے انجام دینے میں تین اغراض کو مدنظر رکھا:

۱-ایسے لوگوں کا پیدا کرنا جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے لائق ہوں۔

۲-ایسے اشخاص کا پیدا کرنا جو ملک میں شرعی خدمات انجام دینے کے قابل ہوں۔

۳-مشرقی تعلیم میں توسیع و اصلاح۔

کمیٹی نے ان اغراض کے حصول کے لیے نصاب تعلیم کے متعلق حسب ذیل تین متفقہ فیصلے کیے:

۱-مشرقی علوم کی تعلیم زیادہ کامل اور مذہبی حیثیت کی بنائی جائے۔

۲-انگریزی زبان کو بطور زبان دوم لازمی قرار دیا جائے۔

۳-نصاب تعلیم میں علوم جدیدہ کو داخل کیا جائے۔

چنانچہ اس نصاب تعلیم میں حسب ذیل مضامین شامل کیے گئے۔

عربی دانی ۱۹۰۹ء کے لحاظ سے:

صرف ونحو	: مزاح رواح، فصول اکبری، کافیہ
۲-علم وادب	: دیوان ابوالفداء، تاریخ الخلفاء
۳-منطق	: ابدال الاسالیب صفحات ۱۸۹-۲۳۷ شرح تہذیب
۴-قوانین (شرع)	: سراجی یا نصاب الموارث۔ شرائع الاسلام
۵-ترجمہ عربی سے اردو بالعکس	

جدید علوم:

۱-انگریزی تعلیم، نظم ونثر۔ ۲-انگریزی صرف ونحو مضمون نگاری۔ ۳-اقلیدس ومساحت۔ ۴-ترجمہ: اردو سے انگریزی۔ ۵-سائنس وجبر ومقابلہ۔

(اقتباس از قواعد وضوابط امتحانات السنہ شرقیہ سرکار عالی)

ممالک محروسہ سرکار عالی کے چیدہ اضلاع اور بلدہ حیدرآباد میں مدارس فوقانیہ شرقیہ کے نام سے متوازی سرکاری درس گاہیں قائم کی گئیں۔ اورنگ آباد میں ایسی ہی ایک درس گاہ سے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جماعت ''مولوی'' کا امتحان ۱۷-۱۹۱۶ء میں کامیاب ہوئے تھے اور بعدازاں بلدہ حیدرآباد آکر ۱۹۱۷ء میں دارالعلوم (جسے اورینٹل کالج درجہ دیا گیا تھا اور جس کے پرنسپل علامہ حمیدالدین فراہیؒ تھے) مولوی عالم کی جماعت میں داخلہ لیا تھا۔(۵)

سیرت النبی ﷺ پروجکٹ: علامہ شبلی کا سیرت النبیؐ کا پروجکٹ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کو اس کی تکمیل کے لیے امداد کے اجراء کا سلسلہ تیرہ سال تک سرکار عالی میں مختلف سطحوں پر زیر غور آتا رہا ہے۔علامہ شبلیؒ کو جو وظیفہ ۱۹۱۳ء میں اجراء ہوا تھا وہ ان کے انتقال پر ادارہ دارالمصنّفین کے نام کردیا گیا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے آس پاس دارالمصنّفین میں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کا نوٹس حکومت ہند نے لیا اور حیدرآباد میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ کو مذکورہ مالی امداد مسدود کروانے کے لیے زور ڈالا لیکن آصف جاہ ہفتم نواب عثمان علی خاں نے مذہبی کاموں کے لیے دی گئی امداد کی مسدودی کو خلاف مصلحت ظاہر کرتے ہوئے یہ امداد جاری رکھی (۶)۔علامہ شبلیؒ نے سیرت النبیؐ لکھنے کا کام شروع کیا تھا جسے بعد میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جاری رکھا اور ریاست حیدرآباد سے اس کی اشاعت کے لیے مالی امداد چاہی۔ چنانچہ سرکاری امسلہ میں اس اہم دینی کام کے آغاز اور اس کے مابعد تسلسل کا تفصیلی تذکرہ ہے نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ ہفتم نے ۱۳۳۷ھ تا ۱۳۶۰ھ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ماہانہ دوسو روپے کلدار منظور کیے تھے۔اس سلسلہ کا پہلا فرمان جو ۷/جمادی الاول ۱۳۳۷ھ کو اجراء ہوا حسب ذیل تھا۔

''چونکہ سیرت النبیؐ کا کام انجام پانا تمام مسلمانان ہند کے لیے خیر و برکت سے خالی نہیں ہے لہٰذا ہماری ریاست کی طرف سے دوسال کے لیے ماہ مبارک ربیع الاول شریف سنہ جاریہ سے ۲۰۰ روپے کلدار ماہوار اس غرض سے دیے جائیں کہ یہ متبرک کام جلد اختتام کو پہنچے''۔

اس کے بعد توسیع امداد کے لیے مسلسل پانچ چھ فرامین جاری ہوئے اور یہ سلسلہ چودہ سال تک چلا جبکہ سیرت النبیؐ کا کام مکمل ہوا۔اس دوران ریذیڈنٹ کی مداخلت کے باوجود نظام دکن نے نہ صرف امداد جاری رکھی بلکہ ۲۶/جمادی الاول ۱۳۵۷ھ سے علامہ سید سلیمان ندویؒ کو سوروپے کلدار ماہوار کا وظیفہ بھی جاری کیا۔(۶)

قیام حیدرآباد: علامہ شبلی نعمانیؒ کا قیام حیدرآباد میں کہاں تھا اور ان کا سررشتہ ترجمہ علوم

وفنون کہا تھا؟ اس سلسلہ کی دلچسپ تفصیل یہ ہے کہ ایک بڑا محلّہ قدیم شہر میں شبلی گنج سے موسومہ ابھی تک موجود ہے جہاں ''جامعہ نظامیہ'' نامی (۱۲۸۲ھ) قائم شدہ (قدیم عربی و دینی درس گاہ موجود ہے اور جہاں تقریباً نصف صدی قبل علامہ ابوالوفا افغانی کا عربی تحقیقی ادارہ دائرۃ المعارف النعمانیہ قائم تھا۔ حیدرآباد ریلوے اسٹیشن کے سامنے جہاں اس وقت رائل ہوٹل ہے حیدرآباد کا مشہور دارالترجمہ ہوا کرتا تھا جو عثمانیہ یونیورسٹی کی مستقل عمارت ہو جانے تک یہیں رہا اور غالباً اسی عمارت میں سررشتہ ترجمہ علوم وفنون ہوا کرتا تھا۔ علامہ شبلیؒ کو دفتر آنے جانے کے لیے گھوڑا گاڑی (تانگہ) کا بندوبست سرکاری طور پر کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر بھی سرکار عالی کی امسلہ میں ہے۔

مآخذ

(۱) حیات شبلیؒ از مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

(۲ تا ۴) پولیٹکل ڈپارٹمنٹ سرکار عالی کی متفرق امسلہ بعنوان شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ۔

(ا) قسط ۷۶ فہرست ۱۶ سلسلہ نشان ۲۰۸۔ (ب) قسط ۷۹ فہرست ۱ سلسلہ نشان ۸۲۲۔ (ج) قسط ۷۹ فہرست ۳ سلسلہ نشان ۷۷۰۔

(۵) سلسلہ نشان ۱۷۵ صیغہ تعلیمات سرکار عالی ۱۳۱۸ء فصلی۔

(۶) (د): قسط ۷۸ فہرست ۸ سلسلہ نشان ۹۹ نسبت امداد سیرت النبیؐ و امداد دارالمصنّفین و ماہوار وظیفہ بنام علامہ سید سلیمانؒ اعظم گڑھ۔

روداد مولانا حالی یک روزہ سمینار

منعقدہ ۲۶/اپریل ۲۰۱۵ء

کلیم صفات اصلاحی

مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ اردو کے عناصر خمسہ میں شامل ہیں۔ اردو زبان و ادب کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر ان کو یکساں دست رس حاصل تھی۔ انہوں نے تاریخ، تنقید اور تذکرہ اور سوانح کے میدانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ بے نظیر اور ملت کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ملک وقوم بالخصوص مسلمانوں کی ذہنی وفکری آبیاری اور علمی و تعلیمی بیداری اور سماجی اور معاشرتی اصلاح کے میدان میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی دلآویز شخصیت، شرافت، انکسار و فروتنی، رواداری، بے نفسی، استغنا اور سادگی سے مرکب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری زندگی میں ایک بھی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ انہوں نے کبھی کسی پر غم وغصہ کا اظہار کیا ہو۔

علامہ شبلی نعمانیؒ سے ان کا تعلق علی گڑھ میں استوار ہوا۔ ملت کو ناگفتہ بہ حالت سے نکال کر اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلانے کا جذبہ دونوں میں قدر مشترک کے طور پر موجود تھا۔ اسی لیے دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ تھے۔ عمر میں بیس سال بڑے ہونے کے باوجود مولانا حالی کے دل میں شبلی کا وہ احترام تھا جو بڑوں کا ہوتا ہے اور شبلی اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ عقیدت مولانا حالی سے رکھتے تھے۔ سال رواں شبلی کے ساتھ حالی صدی کے طور پر بھی منایا جارہا ہے۔ کئی جگہوں پر حالی شبلی مشترک مذاکرے بھی منعقد کیے گئے۔ حالی اور شبلی کے تعلقات اور ملت پر مولانا حالی کے احسانات کا تقاضا تھا کہ ان کو اس موقع پر دارالمصنفین کی طرف سے بھی خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ چنانچہ ۲۶/ اپریل بروز اتوار ''مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں'' کے عنوان پر دو نشستوں پر مشتمل ایک مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔

سمینار کی پہلی نشست ساڑھے نو بجے شروع ہوئی۔ حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی نے تلاوت کی۔

پروفیسر اصغر عباس نے دونشستوں کی صدارت اور نظامت مولانا حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے کی۔ ناظم اجلاس نے پہلے مولانا حالی کی مقبول عام شخصیت کا مختصراً تعارف کرایا۔ اس کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے اس اہم سمینار کے انعقاد کی غرض و غایت سے حاضرین کو روشناس کیا۔ اس اجلاس میں کل پانچ مقالات پیش ہوئے۔ پہلا مقالہ مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا ''مولانا حالی''، دوسرا مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی (اسکالر دارالمصنّفین) نے ''مولانا الطاف حسین حالی کی تحریروں میں بچے اور عورتیں''، تیسرا راقم سطور نے ''شبلی کی حالی شناسی''، چوتھا ڈاکٹر محمد اکرم السلام اعظمی (دہلی) نے ''مولانا حالی اور عربی زبان و ادب'' اور پانچواں ڈاکٹر عمیر منظر (لکھنؤ) نے ''مجالس النساء-ملی دردمندی کا استعارہ'' کے نام سے پیش کیا۔ اس کے بعد ۱۵؍منٹ چائے کے وقفہ کے بعد دوسری نشست ہوئی۔ اس میں بھی کل پانچ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر شباب الدین (صدر شعبۂ اردو، شبلی کالج) نے ''حالی کا نظریہ شعر''، پروفیسر قمرالہدیٰ (شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی) نے ''حالی کی تنقیدی بصیرت کے حوالے سے بعض باتیں''، پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ''حالی - ایک جامع کمالات شخصیت''، ڈاکٹر صفدر امام قادری (شعبۂ اردو کامرس کالج، پٹنہ) نے ''حالی کی نثر غیر افسانوی ادب کا مثالی اسلوب'' اور پانچواں مقالہ صدر اجلاس پروفیسر اصغر عباس نے ''سرسید اور حالی'' کے موضوع پر پیش کیا۔ اس نشست میں سوال و جواب بھی ہوئے۔ جناب محمد عزیر شمس (مکہ مکرمہ) نے ''مسدس حالی اور اس کے اثرات'' کے عنوان سے اس سیمینار کے لیے اپنا مقالہ ارسال کیا تھا۔

اس کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کلمات تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ملت کے اس عظیم محسن کو یاد کرنے کا موقع دیا۔ ہم حاضرین اور اپنے مندوبین کے خاص طور پر شکر گذار ہیں کہ زلزلے جیسے مخدوش حالات میں بھی وہ تشریف لائے۔ یہ مولانا حالی اور دارالمصنّفین سے حد درجہ عقیدت و محبت کے باعث آپ نے یہ زحمت سفر اٹھائی۔ انہوں نے کہا کہ اہل علم کے درمیان مکمل طور پر اتفاق رائے ناممکن ہے لیکن ہمارے بزرگوں میں ایسی وضع داری پائی جاتی تھی کہ ان کے تعلقات پر اختلاف آرا کا اثر نہیں پڑتا تھا۔ ان کا یہ حسن عمل ہمارے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ کیونکہ یہی ہماری میراث ہیں۔ بڑے مایوس کن حالات میں ان بزرگوں نے وہ شمع روشن کی جس کی روشنی میں سفر کرتے ہوئے ملت کا قافلہ آج یہاں پہنچا ہے۔

اخبارِ علمیہ

”قرآن کریم کا قدیم ترین غیر مکمل مخطوطہ“

برلن کی پروشیائی اسٹیٹ لائبریری میں انتہائی قدیم قرآنی نسخے کے ساتھ نازک و لطیف صفحات موجود ہیں جو دراصل چمڑے کے باریک پارچے ہیں۔ جدید سائنسی آلات کے معائنوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کی رحلت کے کچھ سالوں بعد چمڑے پر لکھا گیا تھا۔ ذمہ داروں نے اخبار ”میرکیشے الگمائینے سائٹنگ“ کو بتایا کہ یہ صفحات ایک ایسے جرمن عالم کی ملکیت تھے جو ۱۹ویں صدی کے اواخر اور ۲۰ویں صدی کے ابتدائی برسوں میں قاہرہ میں مصروف تحقیق تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی یہ ملکیت لائبریری نے خرید لی۔ حال ہی میں ان صفحات کو تفصیلی معائنے کے لیے سوئٹزرلینڈ میں زیورخ یونیورسٹی کی ایک لیباریٹری میں بھیجا گیا تو محققین نے ریڈیو کاربن تفتیش کے بعد اس کی عمر کا تعین کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ۶۰۶ء سے ۶۵۲ء کے درمیان لکھا گیا ہے۔ (سہ روزہ دعوت، ۷/اپریل ۲۰۱۵ء)

”مذہب اسلام کی مقبولیت پر ایک جائزہ رپورٹ“

”پیو ریسرچ سنٹر“ امریکہ کا خیال ہے کہ اسلام جو دیگر مذاہب کے مقابلے میں جواں سال مذہب ہے اپنی مقبولیت اور تیزیِ اشاعت کے سبب رواں صدی کے دوران ہی دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔ پیو ریسرچ کے شعبہ ”ریلیجن اینڈ پبلک لائف پروجیکٹ“ کے صدر دفتر میں منعقد ایک سیمنار میں اس رپورٹ پر مباحثہ ہوا۔ جس میں ممتاز محقق کونرڈ ہیکٹ نے کہا کہ دنیا بھر میں شرح پیدائش ۱ء۲ فی خاتون ہے۔ مسلم خاتون کے یہاں یہ شرح اوسطاً تین بچوں کی ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کی ایک تہائی آبادی ۱۵ برس کی عمر میں ہے گویا مسلمان دوسری مذہبی قوموں کے بالمقابل شرح نمو میں اضافہ کے اہل ہیں۔ رپورٹ کے مطابق مسلمان امریکہ میں ۲ فیصد جب کہ یورپ میں ۶ سے ۱۰ فیصد کی شرح سے بڑھیں گے۔ اس کے علاوہ افریقہ میں اعلیٰ شرح کے باعث صدی کے وسط تک ۴۰ فیصد اضافہ ہوگا۔ ہندومت اور یہودیت میں بھی اضافہ ہوگا لیکن بدھ ازم کے پیرووں کی موجودہ سطح باقی رہے گی۔ پینل میں شامل امریکی سفیر

برائے مذہبی آزادی ربی ڈیوڈ اسپرٹین نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ان تحقیقی نتائج نے ایک بار پھر عقائد کے درمیان ہم آہنگی کی ضرورت کو اجاگر کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بعض سائنس دانوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ شماریاتی رجحانات قدرتی اور موسمی انقلاب کی وجہ سے تبدیل بھی ہوسکتے ہیں۔ (تفصیلی رپورٹ راشٹریہ سہارا اردو، یکم مئی ملاحظہ کریں)

''سالانہ ۶۳ لاکھ افراد کی موت''

انسانی صحت کے دشمن امراض بالخصوص پھیپھڑوں کی بیماری کے خلاف کوشاں سرگرم تنظیم ''ورلڈ لنگ فاؤنڈیشن'' نے کہا ہے کہ دنیا بھر میں ہر سال تمباکو نوشی اور اس سے جڑی بیماریوں کے باعث ۶ ملین سے زائد انسان ہلاک ہوجاتے ہیں اور ان سے ہر ایک عالمی تمباکو کمپنیوں کو اوسطاً ۷ رہزار امریکی ڈالر کے برابر فائدہ پہنچتا ہے۔ WLF کے مطابق ۲۰۱۴ء میں ۸۶۵ ارب سے زائد سگریٹیں پی گئیں۔ جس سے عالمی صنعت کو مجموعی طور پر ۴۴ رارب ڈالر کا فائدہ ہوا۔ آبادی کے لحاظ سے دنیا کے سب سے بڑے ملک چین میں یہ رجحان بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے اور وہاں ۱۵ برس سے زائد عمر کا ہر شہری اوسطاً سال بھر میں سوا دو ہزار سگریٹ پیتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ تمباکو نوشی کے باعث ہلاک ہونے والے افراد میں مردوں کے مقابلہ خواتین کی شرح کہیں زیادہ ہے۔ گزشتہ صدی میں تمباکو نوشی سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۱۰ کرور تھی۔ رواں صدی میں یہ تعداد ایک ارب سے بھی زیادہ ہوجانے کا امکان ہے۔ عالمی ادارہ صحت نے خبردار کیا ہے کہ اگر اس کے سدباب کی کوشش نہیں کی گئی تو اگلے تیس سال میں ۱۰ کرور افراد تمباکو سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی وجہ سے موت کا شکار ہوجائیں گے۔ یہ تعداد ایڈز، ٹی بی، کار حادثوں اور خودکشی سے ہونے والی مجموعی اموات سے زیادہ ہے۔ (تفصیلی رپورٹ ۲۹ر مارچ ۲۰۱۵ء کے منصف میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)

''نماز سے ایلفا ویوز ایکٹیویٹی میں نمایاں اضافہ''

''یونیورسٹی آف ملائیشیا'' میں کی گئی ایک تحقیق کے دوران نمازیوں کی جسمانی اور ذہنی

حرکتوں کو نوٹ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ نماز کے دوران دماغ میں ایلفا ویوز حرکتوں میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ اضافہ دماغ کے پرائٹل اور آکسیپیٹل حصوں میں دیکھا گیا جو دماغ کے بالائی اور عقبی حصوں میں واقع ہوتے ہیں۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ بار بار کے تجربات کے دوران یہی صورت حال مشاہدہ میں آئی۔ دیگر مراحل کے دوران ایلفا ویوز میں نسبتاً کم اضافہ ہوتا تھا لیکن سجدہ میں ان کے سگنلز عروج پر پہنچ جاتے تھے۔ ایلفا ویوز انسانی دماغ میں سکون، اطمینان اور خوشی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ روزمرہ زندگی کے مشکلات اور تکلیفوں کے شکار دماغ کو پرسکون کرنے اور دوسری انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں اہم رول بھی ادا کرتی ہے۔ تجربہ کے نتائج اس قدر حیران کن تھے کہ اس تحقیق کو سائنسی جریدہ ''اپلائیڈ سایئکالوجی'' میں شائع کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مغرب کے متعدد جرائد نے اس تحقیق پر مضامین تحریر کیے ہیں اور اعتراف کیا ہے کہ نماز دماغ میں ایلفا ویوز کو نمایاں طور پر بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ (اخبار مشرق، ۲۵/اپریل ۲۰۱۵ء)

''جادوئی پودا، ٹوم ٹاٹو''

برطانوی سائنس دانوں نے بیک وقت آلو ٹماٹر پیدا کرنے والا جادوئی پودا تیار کیا ہے۔ انہوں نے گذشتہ سال ایک ایسے پودے پر تجربات شروع کیے جس کی جڑ میں آلو اور شاخ پر ٹماٹر اگتے ہیں۔ اس پودے کا نام انہوں نے ''ٹوم ٹاٹو'' رکھا ہے۔ یہ منفرد پودا ''ٹیریٹوریل سیڈ کمپنی'' نے تیار کیا ہے اور اس کی فروخت امریکا، برطانیہ اور دیگر ممالک میں شروع کر دی گئی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ پودا گملے میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہر پودے کی پیوند کاری ہاتھ سے کی جاتی ہے۔ یہ صد فیصد قدرتی ہے۔ کسی بھی جینیاتی عمل کے ذریعہ اس کو تیار نہ کرنے کے سبب اس کا ذائقہ بھی صد فیصد قدرتی ہے۔ (اخبار مشرق، ۱۸/اپریل ۲۰۱۵ء)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

تراجم تصانیف شبلی

یکم مئی ۲۰۱۵ء
اعظم گڑھ

مکرمی و محترمی! پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب

مدیر ماہنامہ ''معارف''۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

راقم نے ۲۰۱۱ء میں کتابیات شبلی مرتب کی تھی۔اس میں علامہ شبلی کی تصانیف کے بارہ زبانوں میں ۶۳/تراجم کا ذکر کیا گیا تھا۔جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱-اردو	۴	۲-انگریزی	۱۶
۳-بنگالی	۳	۴-پشتو	۷
۵-تاجک	۱	۶-ترکی	۴
۷-تمل	۱	۸-عربی	۴
۹-فارسی	۲۰	۱۰-کنڑ	۱
۱۱-مراٹھی	۱	۱۲-ملیالم	۱
		میزان=	۶۳

کتابیات شبلی کی اشاعت کے بعد تصانیف شبلی کے کئی اور تراجم دریافت ہوئے ہیں، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱-بنگالی تلخیص وترجمہ: سیرۃ النبیؐ کی ساتوں جلدوں کی مولانا محی الدین خاں نے بنگالی زبان میں تلخیص کی ہے جو ۱۹۹۶ء میں ڈھاکہ، بنگلہ دیش سے شائع ہوئی، یہ ۳۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲-پشتو تراجم: پشتو زبان میں علامہ شبلی کی دو کتابوں سیرۃ النعمان اور الغزالی کا ترجمہ دریافت ہوا ہے۔ یہ دونوں ترجمے بشیر احمد ریان کے قلم سے ہیں اور صدیقی خپر ندویہ تولنہ کاسی روڈ کویٹہ سے شائع ہوئے ہیں۔ان کے ملنے کے پتے درج ذیل ہیں:

۱-صدیقی خپر نودیہ تولنہ کویٹہ۔

۲-صدیقی خپر،ندویہ تولنہ ارک بازار کندھار۔

۳-خیبر خپر ندویہ تولنہ جارہ میوند کابل۔

سیرۃ النعمان کا ترجمہ ۳۳۴ صفحات اور الغزالی کا ۲۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

سیرۃ النعمان کا ایک اور پشتو ترجمہ محمد سعادت کے قلم سے ۱۳۱۵ھ میں پشاور سے شائع ہوا تھا جو ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳-ترکی تراجم: ترکی زبان میں تین کتابوں کے ترجمے معلوم ہوئے ہیں۔سفرنامہ روم و مصر و شام کو یوسف قراچا نے ۲۰۰۲ء میں استانبول سے شائع کیا۔ان ہی نے الغزالی کا ترجمہ ۲۰۱۲ء میں استانبول سے شائع کیا۔اس کے علاوہ سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم بھی فاضل مترجم نے گذشتہ سال ۲۰۱۴ء میں استانبول سے شائع کیا۔

۴-عربی تراجم: گذشتہ چند برسوں میں عربی زبان میں تصانیف شبلی کے کئی ترجمے شائع ہوئے ہیں اور یہ سب کے سب مصری اسکالر جناب جلال السعید الحفناوی کے قلم سے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے:

۱-علم الکلام الجدید۔الجزیرۃ القاہرہ طبع اول ۲۰۱۲ء۔

۲-شعر العجم جلد اول۔المرکز القومی للترجمہ قاہرہ ۲۰۱۳ء۔

۳-الفاروق۔المشروع القومی للترجمہ قاہرہ (س ن)۔

۴-سفرنامہ روم و مصر و شام۔طبع اول الجزیرۃ القاہرہ ۲۰۰۲ء۔

اس طرح اب علامہ شبلی کی تصانیف کے تراجم کی تعداد بڑھ کر ۴۷ ہوگئی ہے۔

والسلام

محمد الیاس الاعظمی

آثار علمیہ وتاریخیہ

علامہ شبلیؒ کا ایک نایاب قصیدہ

جو نواب آسمان جاہ کی کالج میں آمد کے موقع پر پڑھا گیا

اشتیاق احمد ظلی

سہ شنبہ ۲۴؍جولائی ۱۸۸۸ء کو نواب سر آسمان جاہ، مدارالمہام، سرکار نظام حیدر آباد دکن کالج کے معاینہ کے لیے تشریف لائے (۱)۔ معزز مہمان کی تشریف آوری کے شکریہ میں ان کی خدمت میں کالج کمیٹی کی طرف سے علامہ شبلی نے ایک قصیدہ پیش کیا۔ اس قصیدہ کے صرف چند اشعار بر سبیل تذکرہ ''شعر العجم'' میں اور وہاں سے ''حیات شبلی'' میں نقل ہوئے ہیں (۲)۔ چونکہ یہ قصیدہ بھی ''کلیات فارسی'' میں جگہ نہ پا سکا اس لیے سوا سو سے زیادہ عرصہ سے اس کے باقی اشعار اہل ذوق کی نظروں سے اوجھل رہے۔ گذشتہ دنوں ''کلیات فارسی'' کی ترتیب نو کے سلسلہ میں اس قصیدہ کی جستجو ہوئی اور یہ گزٹ کے صفحات میں دستیاب ہو گیا۔

کالج میں معزز مہمان کا قیام مختصر تھا۔ کالج اور اس کی زیر تعمیر مسجد کے معاینہ کے بعد کی سرگذشت خود گزٹ کے الفاظ میں یہ ہے: ''اس کارروائی کے ختم ہونے پر مولوی محمد شبلی صاحب، عربی و فارسی پروفیسر مدرسۃ العلوم، نے کمیٹی کی جانب سے ہز ایکسیلنسی کے تشریف فرما ہونے کا شکریہ ادا کیا جو قصیدہ کی صورت میں تھا'' (۳)۔ اس کے بعد پورا قصیدہ نقل کیا گیا ہے۔ کالج کی تاریخ میں ان یادگار مواقع پر پیش کیے جانے والے قصاید کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ کالج کی نیک نامی اور شہرت میں علامہ شبلی کا جو حصہ رہا ہے وہ ان کی کتاب زندگی کا ایک روشن باب ہے۔ مختلف اسباب وعوامل کی وجہ سے اس کی مکمل اور صحیح تصویر ابھی تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ کالج کی تاریخ میں اس خلا کو پر کرنے کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ میں ان کے قیام کے ابتدائی برسوں میں بھی جب کہ ان کے علمی اور تحقیقی کمالات کے ظہور کی ابھی ابتدا ہی ہوئی تھی، انہوں نے سرسید کی فرمائش پر مہمان ذی وقار کی خدمت میں کمیٹی کی جانب سے نہ صرف قصیدہ پیش کیا

بلکہ ''قصیدہ ختم ہونے پر سرسید احمد خاں نے مولوی محمد شبلی صاحب کا مضمون جو ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' پر تھا اور کتاب ''المامون'' کی جلد دوم جو چھپ کر تیار ہوگئی ہے کمیٹی کی جانب سے نذر گذرانی''۔(۴) اس وقت تک علامہ شبلیؒ کی یہی دو تحقیقات سامنے آئی تھیں اور وہی کالج کی طرف سے بطور تحفہ مہمان گرامی کی خدمت میں پیش کی گئیں۔اس سے اس وقت کالج میں ان کتابوں اور ان کے فاضل مصنف کی قدر و قیمت کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ''مولانا کا ذخیرہ ادب جب تک زندہ ہے کالج کے وہ تاریخی مواقع اب بھی زندہ روزگار ہیں اور رہیں گے''۔(۵)

شعر العجم، جلد اول میں رودکی کے بیان میں علامہ شبلیؒ ایک حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''جس زمانہ میں میں علی گڑھ میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدرآباد، دکن) علی گڑھ میں آئے۔سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاس نامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے اور وہ تم لکھ دو۔میں نے ایک خاص مناسبت سے اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا۔ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے:

ہم چناں باشم گرمِ گفتگو	قاصد از در ناگہاں آید ہمی
افگند شور مبارکباد و پس	ایں حدیثش بر زباں آید ہمی
آسماں جاہ از سوئے ملک دکن	جانب ہندوستان آید ہمی (۶)

''حیات شبلی'' میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ پورا حاشیہ نقل کر دیا ہے اور اس طرح اس قصیدہ کے یہ چند اشعار محفوظ رہ گئے (۷)۔اب جب کہ یہ پورا قصیدہ دستیاب ہوگیا ہے ہم اسے قدر شناسان شبلیؒ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

مژدہ ام در گوشِ جاں آید ہمی	کہ اینک آں صدرِ زماں آید ہمی
تا کند سیراب کشتِ آرزو	ابرِ رحمت در فشاں آید ہمی
آں کہ چشمِ ما براہش بودہ است	خود ہماں دولت فشاں آید ہمی
ہم چناں باشیم گرمِ گفتگو	قاصد از در ناگہاں آید ہمی
افگند شور مبارکباد و پس	ایں حدیثش بر زباں آید ہمی

آسماں جاہ از سوئے ملک دکن جانب ہندوستان آید ہمی

فتح و نصرت در رکابش می دود بخت و دولت ہم عناں آید ہمی

گردِ راہِ او بچشمِ انتظار سرمہِ کز اصفہاں آید ہمی

از قدوم او بہر بزمی سخن داستاں در داستاں آید ہمی

لطف عامش بیں کہ با ایں اوج و جاہ بزم ما را میہماں آید ہمی

اے کہ نبود جز سپاس و شکر تو ہرچہ ما را بر زباں آید ہمی

عذرِ ما نہ گر ز مہرت دم زنیم رازِ الفت خود عیاں آید ہمی

ایں کہ می گویم نہ از مدح و ثنا است شکر نعمت بر زباں آید ہمی

قوم را برگشتہ شد چوں روزگار ویں سخن بر دل گراں آید ہمی

کارِ شاں آخر بداں خواری کشید کاں نہ در وہم و گماں آید ہمی

طرح ایں بیت العلوم انداختند تا مگر بوئے اماں آید ہمی

تا مگر دل خستگانِ قوم را چارہ درد نہاں آید ہمی

پس زیاراں یاوری درخواستند تا ازاں مقصد نشاں آید ہمی

روز اول ہم ز سرکارِ نظام آں کہ نامش حرز جاں آید ہمی

تاچہ بخششہائے گوناگوں رسید کاں نہ در شرح و بیاں آید ہمی

ہم سپاس تو بجا آریم ما کز تو لطفِ بے کراں آید ہمی

ہم ز فیضِ تست کہ ایں قصر رفیع ایں چنیں بازیب و شاں آید ہمی

اختر اقبال تو تابندہ باد بر دعا ختمِ بیاں آید ہمی (۷)

حواشی

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴؍جولائی ۱۸۸۸ء۔ (۲) علامہ شبلی نعمانی، شعرالعجم، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۳-۲۴، ج ۳؛ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۷-۱۵۸۔ (۳) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴؍جولائی ۱۸۸۸ء۔ (۴) ایضاً۔ (۵) حیات شبلی، ص ۱۵۸۔ (۶) شعرالعجم، ص ۲۳-۲۴، ج ۳۔ (۷) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴؍جولائی ۱۸۸۸ء۔

آج کے ادبی تقاضے

مولانا سید سلیمان ندویؒ

(۱۹۴۹ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے انجمن ترقی پسند مصنّفین بھوپال کی پہلی کل ہند کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔ یہ افتتاحی خطاب افکار جوبلی نمبر (جون۔جولائی ۱۹۷۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ ''افکار'' نے اسے غالباً کسی اور مجلّہ سے نقل کیا تھا جس کا نامکمل حوالہ مضمون کے آخر میں موجود ہے لیکن اس کی مکمل تفصیلات دستیاب نہیں۔ اب اہل علم بھی اس سے واقف نہیں ہیں۔ اس کی اہمیت اورافادیت کے پیش نظر اسے پھر سے شائع کیا جارہا ہے۔ اس کے لیے ہم سید صاحب کے خلف الصدق اور اپنے مخدوم ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب کے ممنون ہیں جن کی عنایت سے یہ تاریخی دستاویز ہمیں دستیاب ہوئی)۔

''معارف''

نوجوان ادیبو! اور ہندوستان کی زبان اور قلم کے مالکو!!

خوشی کی بات ہے کہ آج ایسے موقع پر جب لوگ سیاسی اور راج نیتک جھگڑوں میں پھنسے ہیں، چند ایسے لوگ بھی ہیں جو ان سے اونچی باتوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے بھوپال کے ترقی پسند اہل قلم کے بلاوے پہ یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند اہل قلم کیا کہتے ہیں اور کیا بلاوا دیتے ہیں اوران کے دل میں کیا ہے اور یہ کیا چاہتے ہیں، اس کے متعلق کچھ اچھی اور کچھ بری باتیں میں نے سنی ہیں۔ لیکن خود میری زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس میں شریک ہورہا ہوں۔

زبان اور قلم کی قوت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ یہ نعمت جس کو ملی ہے۔ حق ہے کہ وہ اس کی قدر کرے اور اس قوت کو وہ ان کاموں میں صرف کرے جن سے مخلوقات الٰہی کو فائدہ

پہنچے۔ جن سے سچائی ابھرے اور جھوٹ نیچے ہو، جن سے نیکی پروان چڑھے اور بدی پست ہو، جن سے اچھائی پھیلے اور برائے دبے۔ جن سے دیس والوں میں بلکہ دنیا کے بسنے والوں میں میل ملاپ ہو انسانی بھائی چارہ اور امن وامان اور شانتی پیدا ہو، لڑائی کا چرچا بند کیا جائے۔ لوگوں کے دلوں سے انسانوں سے نفرت کرنے کا جذبہ مٹے اور اس کی جگہ پر بروں سے نفرت کی جائے، برائی سے نفرت اور بروں سے ہمدردی کی جائے اور ان کے ساتھ ہمدردی یہی ہے کہ ان کو برائی کی برائی بتائی اور سمجھائی جائے اور جس طرح بیماروں کو نہیں بلکہ بیماری کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور بیماروں سے ہمدردی کرتے ہیں اور ان کی خدمت اور تیمارداری کرتے ہیں، راہ سے بھٹکے ہوؤں اور راہ میں دھوکا کھانے والوں کی خدمت کر کے اور ان کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کر کے ان کو سیدھی راہ سمجھائیں۔

ساری دنیا لڑائی کے زخموں سے چور ہوگئی ہے۔ قوم کی قوم پر چڑھائی دیس کی دیس سے دشمنی اور نسل کی نسل سے نفرت نے انسانیت کے جسم کو لہولہان کر دیا ہے۔ پچھلی دونوں لڑائیوں میں جو کچھ ہوا اس کو کون نہیں جانتا۔ خود اس ملک میں بسنے والوں نے انسان ہو کر جانوروں سے بھی بڑھ کر جو کام کیے وہ ہندوستان کی عزت کی آنکھوں کو جھکانے کے لیے کافی ہیں۔ آج بھی انڈونیشیا اور دکھنی افریقہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ انسانیت کے لیے شرم ہے۔ امپریلزم یا سامراجی اور شہنشاہی کا دور کہتے ہیں کہ ختم ہوگیا۔ لیکن ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صورت بدل گئی ہے، سیرت وہی ہے اور سرمایہ داری اور مزدوری کے جھگڑے اسی کی دوسری شکل ہے۔

نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنی زبان اور قلم کو آگ کے بھڑکانے میں نہیں، بلکہ اس کے بجھانے کے کام میں لائیں۔ آپ اپنے میٹھے بول اور سریلے گیتوں سے غم سے بھرے ہوئے دلوں کو تسکین کا پیام دیجیے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑیے اور محبت کی گھلاوٹ سے نفرت کی تلخی کو دور کیجیے۔ چین اور برما میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس سے ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔

میں نے ترقی پسند ادیبوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب ہماری زندگی کا ساتھ دے۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے جن لوگوں کی نظر مختلف ملکوں کی ادب کی تاریخ پر ہے وہ

جانتے ہیں کہ آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہر قوم کے ہر زمانہ کا ادب اس کی زندگی کی تصویر ہوتی ہے بلکہ قوم اور اس کے زمانہ کے ادب کو پڑھ کر بالکل ممکن ہے کہ ہم اس قوم کی دماغی، ذہنی، تمدنی اور اخلاقی زندگی کا پتہ پالیں۔ کیا شاہنامہ اور فرخی، عنصری وغیرہ کے دیوان نہیں بتاتے کہ سلطان محمود کے عہد میں اس کی مملکت کی کیا فضا تھی اور کیسی عسکریت چھائی ہوئی تھی۔ کیا اندر سبھا، امانت، فسانۂ عجائب، طلسم ہوش رُبا، چار درویش، آرائش محفل، دیوان انشا، دیوان رنگین، دیوان جان صاحب نہیں بتاتے کہ اس عہد کے لوگ کس تمدن کے رنگ و بو اور خیالات و اوہام میں پرورش پا رہے تھے۔ پھر کیا حالی، اکبر، اسماعیل میرٹھی اور شبلی کا کلام، اصلاح و تجدید اور احساس کا پیغام نہیں اور کیا اقبال کا کلام نئی تعلیم اور نئے خیالات کا پیغامبر نہیں۔ زمانہ بظاہر بے زبان ہے مگر حقیقت میں بے زبان نہیں۔ اس کے زمانے کا شاعر۔ ادیب اور مصنف اس کی زبان ہے اور اسی زبان سے وہ اپنا حال دنیا والوں کو سناتا ہے۔ اس لیے آج کے نوجوان ادیب جب اپنے زمانہ کے خیالات کی ترجمانی کرنا چاہیں تو یہ دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہیں۔ یوں ہی ہوا ہے، یوں ہی ہوتا آیا ہے اور یوں ہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے نوجوان ادیب میری آج کی شکل و صورت کو دیکھ کر اور خیالات کو سن کر دل میں یہ کہتے ہوں گے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
خضر کیا جانے غریب اگلے زمانے والے

لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ کبھی میں بھی جوان تھا اور کبھی میں بھی نوجوان ادیب تھا۔ اس وقت کے بوڑھے مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر اسی قسم کے اعتراضات مجھ پر بھی کرتے تھے۔ آخر میں بھی پرانا ہوا اور ان کی عمر کو پہنچا تو مجھے اپنے نوجوان کے نئے تیور دیکھ کر ویسا ہی تعجب آتا ہے۔ غالب کا ایک لطیفہ یاد آیا، غالب نے اپنے کسی شاگرد کو لکھا تھا تمہاری گوری رنگت دیکھ کر مجھے رشک نہیں آیا کیونکہ جب میں بھی جوان تھا تو میرا رنگ بھی چمپئی تھا۔ نوجوانو!

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

میری قلمی خدمت کو نصف صدی گذر چکی ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے ''مخزن'' سے میری قلمی

خدمت کا آغاز ہوا تھا۔ یہ مخزن نئے ادیبوں اور نئے شاعروں کے جذبات اور ولولوں کو لے کر نکلا تھا۔لیکن آج وہ سارے ادیب و شاعر پرانے ہو چکے اور اب نئے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی دنیا ہے۔لیکن عزیزو! ایک دن تم کو بھی پرانا بننا ہوگا اور تمہارا ترقی پسند ادب بھی پرانا ہو چکا ہوگا۔اس لیے نیا اور پرانا ہونا تو کوئی خاص بڑائی کی بات نہیں۔ نہ ہر پرانی چیز غلط ہے اور نہ ہر نئی چیز ٹھیک ہے۔ اس غلط اور ٹھیک ہونے کی کسوٹی اس کی افادیت ہے۔مولانا روم اور سعدی و حافظ کا کلام اب بھی زندہ ہے۔مہابھارت اور رامائن پرانے نہ ہوں گے۔ گیتا آج بھی زندہ ہے اور قوموں کو زندگی دے رہا ہے۔

ہر قوم کا اعلیٰ ادب وہی ہے جس نے اس کو زندگی بخشی ہے اور اب بھی وہی ہوگا جو اس کو زندگی بخشے گا۔سندھی کی کافی، پنجابی کی گرنتھ صاحب، ہندی میں گیتا اور کبیر کا کلام، بنگالی میں ٹیگور اور اردو میں اقبال ادب کے وہ نمونے ہیں جنہوں نے نئے خیالات بخشے اور نئی زندگی پیدا کی۔

حضرات! اس نئی ترقی پسند تحریک کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد سوشلزم یا کمیونزم پر ہے اور ترقی پسند نوجوانوں کے متعلق لوگوں میں اور بھی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ان بدگمانیوں کی وجہ سے ان میں سے بعض کی زبان اور ادب کے اصول اور قواعد سے بے پروائی اور خیال و شعور میں بے اعتدالی اور اس کے اظہار خیال میں فخر پسندانہ بے باکی ہے۔لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب ترقی پسند نوجوان اپنی غلطی کو محسوس کرنے لگا ہے اور اب اس کو دور کرنا چاہتا ہے۔نوجوانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں شروع شروع یہی حال ہوتا ہے، وہ غلطیاں کرتا اور ان غلطیوں کے کرنے میں بے باک ہوتا ہے اور جدت کے شوق میں اپنے لیے نئی راہیں نکالنا چاہتا ہے۔لیکن تجربے کے بعد ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتا ہے اور اپنی غلطی محسوس کرتا ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔شروع میں وہ یہاں تک اعتدال سے باہر تھا کہ فن سے بھی آزاد، اصولوں سے بھی آزاد اور محاوروں سے بھی آزاد تھا۔لیکن اب اس کی آزادی ایک ایک کر کے دور ہوتی جارہی ہے۔ پچھلے چند سالوں کی اس تحریک پر نظر ڈالیے تو میرے اس بیان کی تصدیق ہوگی۔ یہاں پر ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔اہل تحقیق کے نزدیک شاعر اور مقرر میں بڑا فرق

ہے۔شاعر اپنی کہتا ہے اور خطیب دوسروں کی ترجمانی کرتا ہے، شاعر اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو پیش کرتا ہے وہ اپنے میں آپ مست ہوتا ہے اور اس کو دوسروں کی خبر نہیں ہوتی ہے۔ خطیب اور مقرر دوسروں کے خیالات اور دوسروں کے جذبات ابھارنے کا کام کرتے ہیں۔اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو خیالات حافظ کے ہیں اور جن کو انہوں نے اپنے اشعار میں بار بار ظاہر کیا ہے وہ چند سے زیادہ نہیں۔حافظ نے انہیں بار بار دہرایا ہے۔خیام کی رباعیاں پڑھیے، وہی چند خیالات خیام کے پاس ہیں جن کو وہ الٹ پلٹ کر کے کہتا ہے۔صرف طرز ادا میں فرق ہوتا ہے۔معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔یہی حالت موجودہ بڑے شاعروں کی ہے۔ٹیگور کو دیکھیے وہی چند خیالات ہیں وہی چند باتیں ہیں۔اقبال کو اٹھا لیجیے وہی چند باتیں ملیں گی۔یہ ان شعراء کا حال ہوتا ہے جو صاحب پیغام ہوتے ہیں، جن کے پاس چند حقائق ہوتے ہیں، جن کو وہ عمر بھر دہراتے رہتے ہیں۔اور جن کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔اور جن کے ماننے پر ان کے نزدیک دنیا کی صلاح و فلاح موقوف ہوتی ہے۔

حضرات! یقین دلیلوں سے نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ بیان اور صاحب بیان کی سچائی سے پیدا ہوتا ہے۔اس لیے ضرورت ہے کہ ہماری شاعری تکلفات سے سادہ اور مبالغوں سے خالی ہو اور جو بیان کیا جائے وہ شاعر کے دل کی بات ہو، وہ صرف محفل کی گرمی اور داد طلبی کے لیے نہ ہو، میں شاعر نہیں ہوں لیکن مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا۔

اُدھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کسی دعوائے باطل میں

آپ میں سے جن لوگوں کو گاندھی جی کی تقریریں سننے کا موقع ملا ہو وہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی اچھے مقرر نہیں تھے۔گاندھی جی کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ان کے ہندوستانی کے لفظ بھی ٹھیک نہیں ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی ہندوستانیوں نے ان کے قلم اور زبان سے کتنا فائدہ اٹھایا۔اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جو کام گاندھی جی نے اس ملک میں کیا وہ کسی ملک میں انجام نہیں دیا گیا۔دنیا کے دوسرے حصوں میں دیکھیے کیا ہو رہا ہے۔چین کی خانہ جنگی نے اس کا کیا حال بنایا ہے، برما میں خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔انڈونیشیا میں سیاسی مکاری اور چالبازی

کا مظاہرہ ہورہا ہے لیکن گاندھی جی نے ہندوستان میں جس خیال کو پیش کیا تھا۔ وہ سادہ عملی فلسفہ تھا۔ وہ محض جذبات نہ تھے، ان کا یہ فیصلہ اصول پرمبنی ہے۔ ان کا یہی فلسفہ ہے جس نے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ جس کے ذریعے وہ ملک میں امن وامان پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگر ملک کے تمام فرقے سچائی کے ساتھ ان پر عمل کرتے اور اس میں نفاق نہ برتتے تو اتنا بھی نہ ہوتا جتنا ہندوستان میں ہوا جس پر سب کو افسوس ہے۔

ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ ملک کی خاطر کام کریں اور باہمی اتحاد کا پیام عام کریں۔ وہ طبقات کی نفرت کے بجائے لوگوں کو محبت کا پیام سنائیں۔ ان کی شاعری صرف واہ واہ اور ہر قدیم کی بیخ کنی اور ہر پرانی بات کی توہین نہ ہو۔ غرض کہ ان کی شاعری کا مقصد تعمیر ہو، تخریب نہ ہو۔ نئی شاعری کے نئے انداز اور نئی پرواز اور نئے تقاضوں سے ہم کو انکار نہیں، نہ ہم کو سرمایہ داری کی مذمت، کسانوں اور مزدوروں کی مظلومی کی داستان سے انکار ہے لیکن ضرورت یہ ہے کہ دہقان کے پسینہ کی بربادی اور غریبوں کی تباہی پر ہمدردی ہو۔ صرف محفل کی گرمی کے لیے مزدور، کھیت، کسان، دہقان، جھونپڑی کا تذکرہ نہ ہو۔ ورنہ یہی کہا جائے گا کہ جس طرح اگلے شعراء گل وبلبل سے اپنا مطلب ادا کرتے تھے۔ اسی طرح آج دہقان، کھیت اور مزدور سے مقصد کو ادا کیا جارہا ہے۔ حقیقت نہ وہاں تھی نہ یہاں۔

حضرات! یہی چند باتیں تھیں جن کو اختصار کے ساتھ مجھے آپ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ ابھی ہم کو اپنے نئے ادب کی تعمیر کے لیے جو ملت کی بھی تعمیر کا سبب ہے بہت کام کرنا ہے۔ نوجوانو! قدم آگے بڑھاؤ زمانے کی قوت تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ باایں ہمہ اپنے وقت کے بوڑھوں کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ بوڑھے حافظ کا مشورہ ہے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیر دانا را

ان مختصر لفظوں پر میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے عزیز مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ (شمارہ ۳،۱-۳، سنہ ۱۹۴۹ء)

مطبوعات جدیدہ

مقالات ابوالمآثر جلد دوم: از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مرتبہ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۰، قیمت ۱۶۰ روپے، پتہ: مدرسہ مرقاۃ العلوم، پٹھان ٹولہ، مئو، یوپی ۲۷۵۱۰۱، اور مئو کے دیگر مکتبے۔

محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے قلم میں کیا برکت تھی کہ انھوں نے علم وفن حدیث شریف کے علاوہ علمی و دینی موضوعات پر بے شمار کتابیں، رسالے اور مضامین کا ایک جہان آباد کر دیا، ان کے مضامین مطبوعہ بھی ہیں اور مسودات کی شکل میں بھی محفوظ ہیں، جو ان کے نہایت لائق عزیز اور نواسے اور اس کتاب کے مرتب کی محنت اور دلچسپی کی وجہ سے کتابی شکل میں عام استفادے کے لیے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان ہی میں یہ سلسلہ مقالات بھی ہے، عرصہ ہوا اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ اب دوسری جلد میں قریب چھبیس مقالات جمع کیے گئے ہیں، ختم نبوت، رحمۃ للعلمین، وتر کے بعد کی نفل نماز، اسلام اور صنف نازک، رویت ہلال، ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات، مسئلہ کفو، سیدالشہداء واقدی، حضرت معاویہ، ابراہیم بن ادھم وغیرہ مضامین میں بظاہر ربط نہیں، لیکن علم و تحقیق کے سررشتہ ہی ان کو ایک ربط خاص کی شناخت عطا کرتا ہے۔ یہ بالکل صحیح تاثر ہے کہ محدث الاعظمی نے ہمیشہ بوقت ضرورت ہی لکھا، لیکن یہ ضرورت بہرحال اپنی اہمیت کے لحاظ سے وقتی نہیں کہی جاسکتی، افادیت تادیر قائم رہنے والی ہے۔ خاتم النبیین کے زیر عنوان مضمون صرف چھ صفحات کا ہے لیکن یہ قرآن وحدیث کا گویا عطر ہے اور سب کا ماحصل یہی کہ خاتم النبیین سے مراد آخری نبی ہے، اس کے بعد کسی اور مفہوم کی کوئی گنجائش ہی نہیں، وتر کے بعد کی نفل نماز کے متعلق مولانا اعظمی کا خیال ہے کہ ان دو رکعتوں کو بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے، اسی طرح پندرہویں شعبان کے روزے کے متعلق ابن ماجہ کی روایت کو وہ موضوع نہیں مانتے، اس قسم کے مسائل میں مولانا مرحوم کے اپنے دلائل ہیں لیکن جو بات قابل

لحاظ ہے وہ ان کا یہ رویہ ہے کہ بات پسند آئے تو دعا اور نہ اختلاف رائے پر مطلق ملال نہیں کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ہر شخص میرے خیال کا پابند ہو جائے۔اس اصول نے رویت ہلال کا مسئلہ ہو یا مسئلہ کفو ہو، حضرت حسینؓ کے لیے سید الشہداء کا لقب ہو یا حضرت معاویہؓ اور یزید بن معاویہ کے مناقب و فضائل ہوں، ان کے خیالات کو احترام کے لائق بنا دیا۔ واقدی کے متعلق بھی ان کا مختصر مضمون، محققین کے عام تاثر کے برخلاف ہے لیکن مولانا نے پورے یقین سے کہا کہ ''جن لوگوں نے واقدی پر کذب و وضع کا الزام لگایا ہے انہوں نے ثبوت میں ایک بھی ایسی حدیث پیش نہیں کی جس کو خود واقدی نے وضع کیا ہو''۔ چھوٹے چھوٹے مضامین کی لڑی میں تحقیق و جستجو کے یہ بیش قیمت موتی واقعی محدث کبیر کی تحقیقی شان کے عین شایاں ہیں اور پڑھنے والوں کے لیے فکر و نظر کی راہیں روشن کرنے والے ہیں۔

خیال یار مہرباں : از پروفیسر عبدالحق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: پروفیسر عبدالحق ۲۳۱۵، ہڈسن لائن، کنگز وے کیمپ، دہلی ۱۱۰۰۰۹۔

کتابوں پر تبصروں کو جمع کرنا آج کے تصنیفی دور میں نہ حیران کن ہے اور نہ معیوب، لیکن یہ کاوش اس وقت مستحسن اور مفید بن جاتی ہے جب کوئی بلند پایہ، صاحب نظر، صاحب اسلوب اور لائق تقلید محقق و نقاد ان تبصروں کو خود جمع کرے اور اس احساس کے ساتھ کہ ان سے استفادے بجائے خود ایک علمی و اکتسابی عمل ہے۔ فاضل محقق موجودہ اردو تحقیق و تنقید میں جس انفرادی شان کے ساتھ مقام امتیاز پر فائز ہیں، وہ کم ہیں جو اس میں شریک و سہیم ہیں، اقبالیات میں تو ان کو درجہ امامت حاصل ہے۔ اقبال شاعر رنگیں نوا نام سے ان کی کتاب کے بارے میں معارف ہی نے لکھا تھا کہ یہ آفاق اقبال میں گم ہو کر سیر آفاق کی ایک مثال ہے، اقبالیات کے علاوہ دیوان زادہ، دیوان حاتم جیسی محققانہ کتابیں اور ذکر یار مہرباں اور رشید احمد صدیقی کا ثقافتی منظر نامہ تذکرہ نگاری میں اور ترسیل و ترجمہ جیسی فنی کتاب، ان سب نے اردو کے اعلیٰ ادب کوئی بلندیوں سے روشناس کرایا، زیر نظر کتاب میں ان تمام تصنیفات پر ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی، پروفیسر تو قیر احمد خاں، پروفیسر محسن عثمانی، ندیم صدیقی، ڈاکٹر

عبدالباری، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر خالد ندیم، ڈاکٹر خالد اشرف جیسے اہل نظر کے تبصرے ہیں، کچھ تبصرے معارف نوازی کے طفیل بھی ہیں۔ تبصرے اگر کسی کتاب کے مطالعہ کے لیے محرک اور باعث اشتیاق ثابت ہوں تو یہی ان کی کامیابی ہے۔ لیکن زبان حق تو کچھ اور بھی کہتی ہے اور کس خوبصورت لہجہ میں ! لکھتے ہیں ''زبان غیر کی شرح سے آرزوئیں انشراح صدر میں تبدیل ہوجاتی ہیں اور آئین و حکم بن کر محاسبے کے لیے روبرو آئینہ فراہم کرتی ہیں، اپنے وجود کے نہاں خانے کو بے پردہ دیکھنے کے لیے یہی موزوں ترین میزان ہے''۔ یہ کتاب محض تبصروں کی اشاعتی روایت نہیں ہے، یہ جوہر اور جوہری کی قدر شناسی کا وہ عمل ہے جس سے مینا بازار ہمیشہ سجتے رہے۔

مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ : از جناب محمد محامد ہلال اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۴۸، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد، تلنگانہ اور ادبی دائرہ، اعظم گڑھ یوپی۔

شبلی صدی کی برکت ہے کہ وادی تحقیق و تنقید میں نو واردوں کا ایک دلکش ہجوم ہے جس نے علوم شبلی کو فکر و نظر کا محور قرار دے کر ایک صدی قبل کے خزانوں کو نئی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی اور اس طرح ان کی فکر اور نظر دونوں کو صحیح سمت میں سفر کرنے کی توفیق ملی، زیر نظر کتاب بھی اسی زمرہ میں آتی ہے جس میں علامہ شبلی کی شاعری کا بظاہر طالب علمانہ لیکن حقیقت میں عالمانہ مطالعہ کیا گیا، مثنوی صبح امید اور مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور رثائی منظومات کا جائزہ لیا گیا اور فنی محاسن کے ساتھ شاعر کی فکر اور خود شاعر کے مقام کے تعین کی کوشش کی گئی، پروفیسر مظفر شہ میری کے الفاظ میں یہ کوشش دلچسپ بھی ہے اور معلومات افریں بھی۔ ایم فل کا یہ مقالہ اگر شعر شبلی پر درجہ استناد تک پہنچ گیا تو ایک نو وارد اور نو مشق کے لیے اس سے زیادہ افتخار کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

مرزا غالب : از ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳۔

غالب کی خدا جانے کتنی تمناؤں میں ایک یہ بھی تھی کہ نہ جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا لیکن شکر ہے کہ یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔آج مرقد غالب، مزار و مرجع ہے، درگاہ خواجہ نظام الدین کے قرب آج بھی مرزا غالب پر فاتحہ پڑھنے والے کی زبان پر یہ اعتراف لے آتا ہے کہ تجھے ہم ولی سمجھتے .... غالب کے کلام کی شہرت نے متعلقات غالب کو جس طرح نمایاں کیا اس کا اندازہ ذخیرہ غالبیات سے کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہے اکبرآباد اور دلی کی حویلیوں کے ساتھ ان کی آخری آرام گاہ، محققین بلکہ محبین غالب کیوں کر نظر انداز کرتے۔اس کتاب کے مصنف اپنے تحقیقی ذوق ونظر کے لیے مشہور ہیں، انہوں نے کئی سال پہلے مرزا غالب کے عنوان سے طویل مضمون لکھا، یہ موضوع کی جدت کی بنا پر پسند کیا گیا اور یہی پسند اس مطالبہ کا سبب بن گئی کہ اس کو کتابی شکل میں کچھ اور اضافوں کے ساتھ آنا چاہیے، زیر نظر کتاب اسی پسند اور طلب کا نتیجہ ہے اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی بحث سامنے آگئی جو صرف مرزا غالب کے جائے وقوع تک محدود نہیں رہی بلکہ تاریخ کے اس سوال کا جواب بھی بن گئی کہ اردو کے ممتاز شاعروں، ادیبوں کے مزارات کو قومی یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کا خیال اول اول کس کے ذہن میں آیا؟ ذوق دہلوی کے مزار کے متعلق شیخ عبدالقادر نے نامور گذشتگان کی نشانیوں کو بچانے اور ان کی حفاظت کے لیے کس ضرورت کا اظہار کیا۔رہا اصل موضوع تو تدفین، مدفن، لوح مزار، مزار کی ابتدائی شکل، وقتاً فوقتاً مزار کی مرمت وتعمیر کی کوششیں، غالب سوسائٹی اور غالب اکیڈمی کا قیام جیسے عنوانات کے تحت چھوٹی بڑی تمام معلومات جس خوبی سے تلاش و یکجا کی گئی ہیں وہ دلچسپ بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی، ڈیڑھ سو سال کے واقعات کی کڑیوں کو ڈھونڈنا اور جوڑنا آسان کام نہیں، مصنف کے حواشی بھی قیمت میں کچھ کم نہیں۔ایک ابتدائی تحریر ڈاکٹر عقیل احمد کے قلم سے ہے، انہوں نے لکھا کہ ''سوئے اتفاق کہ غالب کا مزار حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے راستے میں ہے'' یہ درگاہ کے راستے میں غالب کے مزار کا ہونا سوئے اتفاق کیوں؟

ع-ص

رسید کتب

(۱) **روئے خوش رنگ:** غضنفر، بشریٰ پبلیکیشنز، حمزہ کالونی، نیو سرسید نگر، علی گڑھ۔

قیمت =/۲۵۰ روپے

(۲) **ریحان خرد (تنقیدی مضامین کا مجموعہ):** ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر۔ قیمت =/۱۱۹ روپے

(۳) **زیارت قبور وایصال ثواب:** سجادہ شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی، فرید بک ڈپو، (پرائیوٹ) لمیٹڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت =/۱۵۰ روپے

(۴) **سید احمد شہیدؒ۔ شخصیت، تحریک اور اثرات:** ڈاکٹر شاہ عبادالرحمٰن نشاط، ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی۔ قیمت =/۱۴۰ روپے

(۵) **شبلی اور جہان شبلی:** ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، غلامی کا پورہ، عقب آواس وکاس، اعظم گڑھ۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

(۶) **عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات (تنقید کے حوالے سے):** ڈاکٹر گلشن طارق، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ۸۔ پہلا منزلہ ہندوستان بلڈنگ، ۱۰/ٹی پی اسٹریٹ، ممبئی۔

قیمت =/۵۰۰ روپے

(۷) **قرآنی دروس (حصہ اول ودوم):** ظفر الاسلام اصلاحی، ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ۔ قیمت =/۱۰۰ روپے

(۸) **کیفی اعظمی حیات اور شاعری:** ڈاکٹر محمد اسعد، عبید بک ڈپو، ۵۰۱، مٹیا برج محل، جامع مسجد، نئی دہلی۔ قیمت =/۲۷۵ روپے

(۹) **محفل قرآن (جلد چہارم):** مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، الفرقان بک ڈپو، ۳۱/۱۱۴، نظیر آباد، لکھنؤ۔ قیمت =/۳۵۰ روپے

(۱۰) **مستشرقین اور انگریز تراجم قرآن (پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کے مضامین):** پروفیسر اختر الواسع، البلاغ پبلیکیشنز، N-1، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۔ ۲۵ ۔ قیمت =/۱۲۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	240/-
الغزالی	200/-
المامون	100/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر		85/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		100/-
کلیات شبلی (اردو)		180/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	//	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	//	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	//	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	//	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	//	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	//	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	//	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	//	150/-
مکاتیب شبلی دوم	//	190/-
شذرات شبلی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
MAY 2015 Vol- 195 (5)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Office Mobile) 7607046300

تصانیف ومطبوعات شبلی صدی تقریبات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)		علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی		ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دار المصنّفین کے سو سال		کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)		مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی		علامہ شبلی نعمانی تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس		ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	سیرت عائشہ	(ہندی ترجمہ)	علامہ سید سلیمان ندوی	325/-
۸۔	عرب وہند کے تعلقات	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	200/-
۹۔	خطبات مدراس	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	125/-
۱۰۔	دین رحمت	(ہندی ترجمہ)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۱۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، اول	(ہندی ترجمہ)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	125/-
۱۲۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دوم	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	180/-
۱۳۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سوم	(ہندی ترجمہ)	〃 〃	225/-